

دکن کی بی بی آپ بیتی کا قلم: شکیلہ

سکرپٹس

2014

نئی

نئی

ڈاؤن

اس قسم کی کتابیں خریدیں اور پھر انہیں اپنے محرمات کو پیش کریں

اور انہیں دیکھ کر انہیں پتہ چلے گا کہ ان کی زندگی کتنی بے وقعت ہے

یہ سب کچھ ان کے لیے ہے جو ان کی زندگی بھر کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

شوہرین

161

شکیل صدیقی

ایک لجنہ اداکار کی زندگی کا پرتو، حالات و واقعات سے گندھی تہلکہ خیز داستان

دوسری سچ بیانی

239

عمران قریشی

ایمان کی حبیبی فطرت ہوتی ہے وہ ویسا ہی ہوتا ہے

دوسری سچ بیانی

265

فاطمہ زہرا

اس نے خود کو مکمل نہیں پایا ادھوری ہی کہلائی

انہویں سچ بیانی

279

مینہ تاج

وہ اپنی ہی آگ میں جلنے پر مجبور ہے

انہویں سچ بیانی

287

اصف اقبال

پراسرار سچ بیانیوں پر مبنی انکشافی پارچے

انہویں سچ بیانی

000

قارئین / ادارہ

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق برحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سراب

182

کاشف ز

بلند حوصلوں اور بے مثل دلوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

تیسری سچ بیانی

249

فران

اس کا سب سے بڑا حیرم ہی یہی تھا

چھٹی سچ بیانی

267

سبیل جعفری

آج کے حالات کی بھرپور عکاسی

یہ تھا

274

یہ نام

اس نے کامیابی کا عجب گر حاصل کیا

سوغات

287

اصف اقبال

دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر مبنی انکشافی پارچے

پاپی توازن

228

بیک سجاد افریدی

زندگی کے مد و حیر کی عکاسی تحریر

چوتھی سچ بیانی

259

ریحان باسط

وہ اس قبر پر گاڑی کا پڑھا ادا کرتی تھی

پانچویں سچ بیانی

274

کامیاب

اس نے کامیابی کا عجب گر حاصل کیا

سوانح سچ بیانی

279

مینہ تاج

وہ اپنی ہی آگ میں جلنے پر مجبور ہے

انہویں سچ بیانی

287

اصف اقبال

پراسرار سچ بیانیوں پر مبنی انکشافی پارچے

انہویں سچ بیانی

000

قارئین / ادارہ

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق برحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

وہ کون تھا

65

صائمہ اقبال

ایک پراسرار سچ بیانی

شہر گزشت

59

امین بھائیانی

کلیں کے ایسا گزشتہ کا تذکرہ حالات کا تقابلی جائزہ آپ لے سکتے ہیں

شہر گزشت

85

علی سفیان افقی

اچھے سفر نامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ نثر کہانی

فلم و صحافت

113

علی سفیان افقی

فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، صاحب علم کی ہدایت کے لیے خاص

فلم و صحافت

138

منظر امام

صاحب علم کی ہدایت کے لیے خاص

منظر امام

143

حسن رفیقی

پی آئی اے کے ایک ریٹائرڈ افسر کی خود نوشت

شہر خیال

16

مدیر

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شہر گزشت

59

امین بھائیانی

کلیں کے ایسا گزشتہ کا تذکرہ حالات کا تقابلی جائزہ آپ لے سکتے ہیں

شہر گزشت

85

علی سفیان افقی

اچھے سفر نامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ نثر کہانی

فلم و صحافت

113

علی سفیان افقی

فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، صاحب علم کی ہدایت کے لیے خاص

فلم و صحافت

138

منظر امام

صاحب علم کی ہدایت کے لیے خاص

منظر امام

143

حسن رفیقی

پی آئی اے کے ایک ریٹائرڈ افسر کی خود نوشت

عقل نشین

24

ڈاکٹر ساجد امجد

اس سائنسدان نے انسان کو بسندہ کی اولاد ثابت کیا

عقل نشین

65

صائمہ اقبال

ایک پراسرار سچ بیانی

عقل نشین

109

سیا سفیق

ایک معذور ماہر طبیب کی زندگی جہد مسلسل کی داستان

عقل نشین

143

حسن رفیقی

پی آئی اے کے ایک ریٹائرڈ افسر کی خود نوشت

عقل نشین

143

حسن رفیقی

پی آئی اے کے ایک ریٹائرڈ افسر کی خود نوشت

عقل نشین

143

حسن رفیقی

پی آئی اے کے ایک ریٹائرڈ افسر کی خود نوشت

ماہنامہ گزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی پارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔ تمام اشتہارات تنگ نیکی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمہ دار نہ ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جلد 24 • شماره 06 • مئی 2014ء

ماہنامہ
پاک سوسائٹی

مدیر: علی: عذرارسل

مصور: شاہ حسین

قارئین کرام!
السلام علیکم!

ادب کا سیاہی

سرگزشت

پٹنہ (بہار) کے ایک صاحب علم گھرانے میں اس نے جنم لیا۔ گھرانہ پڑھے لکھے لوگوں کا تھا اس لیے بچے کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ ابتدا میں مروجہ تعلیم دی گئی۔ عربی فارسی کی جانب تو خصوصی توجہ دی گئی۔ حفظ قرآن بھی جاری رہا۔ صرف و نحو پر خصوصی توجہ دی گئی۔ پھر انگریزی تعلیم کی جانب سفر شروع ہوا اور محمد ان اینگو اسکول میں داخل کرایا گیا مگر وہاں زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ اسے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ علی گڑھ کے اسکول میں ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا کہ میجر سید حسن بلکرای کے کہنے پر بلکرای ٹیوٹوریل کالج میں آ گیا۔ اس کالج میں لڑکے جو نیر اور سینٹر کیرج کی تیاری کرتے تھے، مسٹر لیسن ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہاں کا ماحول بالکل انگریز کا تھا۔ تاکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریز جانے پر کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اپنی انگلش کی استعداد بڑھانے کے لیے وہ ایک ایک دن میں پندرہ پندرہ اخبارات پڑھتا۔ ابھی تعلیمی سلسلہ جاری تھا کہ میجر حسن بلکرای کا انتقال ہو گیا۔ اسے واپس پٹنہ آنا پڑ گیا۔ پٹنہ پہنچ کر اس نے کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دینے کی تیاری شروع کر دی۔ امتحان پاس کرنے کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ انگریز جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے مگر جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی۔ ان حالات میں انگریز جانا ناممکن سی بات تھی اس لیے اس نے پٹنہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ چار برس میں بی اے بھی پاس کر لیا۔ انہی دنوں والد کا انتقال ہوا اور وہ گھر کا ہو کر رہ گیا۔ گھر پر رہتے ہوئے بھی وہ مطالعہ کرتا رہا۔ سر سید احمد خان اور شبلی کی مذہبی تصنیفات میں اس نے دلچسپی لی۔ حسرت موہانی کی شاعری کا مطالعہ کیا۔ سیاسی طور پر وہ کانگریس سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ مظہر الحق، ابوالکلام آزاد اور محمد علی جوہر کا معتقد بننا جا رہا تھا۔ الہلال کے ہر شمارے کا اسے انتظار رہتا۔ 1922 میں اس کی شادی شاہ رشید اللہ کی بیٹی سے ہوئی۔ رشید اللہ پٹنہ کے بڑے وکلاء میں شمار ہوتے تھے اس لیے اس کی عزت خوب بڑھ گئی۔ شادی کے اگلے برس وہ مزید تعلیم کے لیے انگریز چلا گیا۔ وہاں مل ٹیمل میں اسے داخلہ ملا۔ پھر کچھ دنوں کے لیے جرمنی چلا گیا۔ جرمنی میں وقت گزار کر لوٹا تو اس نے کیمبرج میں داخلہ لیا۔ ابھی آخری امتحان باقی تھا کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ اسے سینوریم میں داخل کر دیا گیا۔ چھ ماہ علاج کرنے کے بعد سوئٹزر لینڈ چلا گیا اور موتھانہ کے استقانون سینوریم میں داخل ہو گیا۔ وہاں مسز جواہر لعل نہرو بھی علاج کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ اچھا وقت گزر رہا تھا۔ چھ ماہ کے علاج سے وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا اور واپس کیمبرج آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے امتحان دیا اور کامیاب ٹھہرا پھر وہ 1929ء میں واپس برصغیر آ گیا اور یہاں پہنچ کر اس نے تصنیف و تالیف میں دل لگا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شمار بڑے مصنفین میں ہونے لگا۔ اس نے ادارہ تحقیقات اردو قائم کیا اور اردو کتب کی اشاعت کا اہتمام کرنے لگا۔ سب سے بڑا کام اس نے یہ کیا کہ غالب کی کل تصنیفات کا صد سالہ ایڈیشن ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے سے ترتیب دے کر شائع کیا جس کے لیے رقم بھی ڈاکٹر ذاکر حسین کے فنڈ سے ملی۔ ادب اردو کے اس سپاہی کو دنیا قاضی عبدالودود کے نام سے پہچانتی ہے۔

اخبار کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی خبر دیکھی کہ ایک سرکاری اسکول کی عمارت کو علاقے کے دڈیرے نے بھینسوں کا باڑا بنا رکھا ہے۔ یہ کہانی کسی ایک علاقے کی نہیں ہے۔ اگر تلاش کیا جائے تو سیکڑوں کی تعداد میں ایسے اسکول مل جائیں گے جو بھینسوں کے باڑے یا اوطاق میں بدل چکے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ قرآن پاک کا پہلا لفظ ”اقراء“ یعنی پڑھ کو ہم نے کلی طور پر فراموش کرنے کا عہد کر لیا ہے۔ تبھی تو اسکول کی عمارتوں کو دھماکے سے اڑانے کی کوشش بھی کر لیتے ہیں۔ یہ تو رہا دور افتادہ گاؤں گوٹھ کا قصہ، شہروں کا حال بھی الگ نہیں ہے صرف انداز جدا ہے۔ یہاں سرکاری اسکول تکذیب کا نشان ہیں۔ ان اسکولوں میں پڑھنے والوں کو حقیر نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور پرائیویٹ اسکولوں کو کاروبار کا درجہ دے دیا گیا ہے جہاں تعلیم دینے کے بہانے پیسا کمانا نصب العین ہے۔ تعلیم کے ساتھ ایسا مذاق دیکھ کر ہم تو یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ آنے والی نسل کو ”اقراء“ کے حلقے سے نکال باہر کیا جائے مگر ہم کیا کریں کہ چپ نہیں رہ سکتے۔ بقول فراق گورکھپوری۔

آنے والی نسلوں کو کچھ نفع دے کر اٹھ جاؤں گا
بار بار گائیں گے لیکن جی نہ بھرے گا، جی نہ بھرے گا

معراج رسول

شعبہ اشتہارات

نیشنل پبلکیشنز محمد نواز خان 0333-2256789

نیشنل پبلکیشنز محمد نواز خان 0333-2168391

نیشنل پبلکیشنز محمد نواز خان 0323-2895528

نیشنل پبلکیشنز محمد نواز خان 0300-4214400

♦♦♦♦

قیمت فی پرچہ 60 روپے • ڈیزل سالانہ 700 روپے

پبلشر: پروپرائٹر: عذرارسل

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹنشن

ڈپٹی کنٹرولر پبلیکیشنز گورنمنٹ

کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ارجن سن پرنٹنگ پریس

ہائی اسٹینڈیم کراچی

علاقہ کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 335004200 Fax: 33802551
E-mail: jdggroup@hotmail.com



کی وہ منازل طے کر پائے گا جس پر ہمیشہ ایک مخصوص طبقہ کا قبضہ رہا ہے۔ ایک طبقہ اے لیول اور ایلول کر رہا ہے جبکہ دوسرا ایف اے، بی اے، وہ بھی باقی سہولیات کے ساتھ۔ کیا یہ طریقہ تعلیم معاشرے کو جوڑے گا یا تقسیم کرے گا۔“

سردار بانو ناگوری، کراچی سے فرماتی ہیں: ”ادارے میں معراج اٹھل اپنے مخصوص طرز تحریر کے ساتھ ہمیں آنے والی مہنگائی کے طوفان سے ہوشیار کرتے نظر آئے، واقعی سوچنے کا مقام ہے لیکن صرف کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر سوچنے اور غور و فکر کرنے سے مسائل کا حل نکل سکتا ہے؟ کیونکہ ہم اس سرزمین پر رہے ہیں کہ جہاں صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کو بھی ان گنت مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، اگر ہم اپنی غلطیوں سے سبق نہ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے تو شاید ہمارا شمار بھی ان ممالک میں ہوتا کہ جن کی فراخ دلی اور حب الوطنی کا جذبہ ہمیں شرمندگی سے دوچار کر دیتا ہے۔ شہر خیال کی محفل کی طرف بڑھتے تو مٹی عزیز نے اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ عزیز بھائی آپ کی سرگزشت سے محبت، جذبات اور خوبصورت تبصرے کو داد دے دیتا سرسبز یادتی ہوگی ہماری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ رخصت افضل، خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ کو ہمارا تمبرہ پسند آیا۔ فاضل علی، آپ نے لکھا ہے کہ آپ سرگزشت کو پہلے شمارے سے پڑھ رہے ہیں لیکن لگتا ہے آپ ابھی تک سرگزشت پڑھنے والوں کے مزاج کو سمجھ نہیں سکتے۔ وحید ریاست بھائی، ہم آپ کی رائے سے سو فیصد متفق ہیں اور ہم بھی اپنے پیارے اور محترم اٹھل کی سرگزشت پڑھنے کے خواہش مند ہیں۔ رانا شاہد بھائی، کامیابی حاصل کرنے پر ہماری طرف سے ڈھیروں مبارکباد قبول کیجئے۔ ہم نے ایک میگزین میں آپ کی اور عزیز نے کی تصاویر دیکھی ہیں۔ واقعی آپ کی تحریریں آپ کی شخصیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ احسان سحر نے بھی خوب لکھا اور دیگر ساتھیوں کے تبصرے پسند آئے۔ ابن کبیر کی تحریر پڑھ کر تو ہم حیران رہ گئے کہ ایسے پراسرار مرض نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی جان لی۔ قلمی الف لیلہ میں فیض احمد فیض کا زندگی نامہ پڑھ کر مزہ آگیا۔ فیض صاحب کی بیٹی کی زبانی اس عظیم شاعر کی زندگی کے ان پہلوؤں کو جاننے کا موقع ملا کہ جو شاید تا عمر ہمارے حافی سے پوشیدہ ہی رہتے۔ مجذوب اردو، ایاز راہی کے قلم سے منو کے فن کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے ہمیں بے انتہا دکھ آنے لگا کہ اسے علم فن سے تاریخ رقم کرنے والا بعد مرنے کے وہ مقام وہ پیمانہ نہیں حاصل کر سکا جو اردو ادب کے اس عظیم ادیب کا حق تھا اور منو کا یہ دعویٰ کہ سعادت حسن تو مر سکتا ہے مگر منو نہیں، سو فیصد درست ہے۔ واقعی اردو ادب کو تاریخ میں اپنے فن سے زندہ رکھنے والا منو بھی مر ہی نہیں سکتا، وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ شاعر اعظم ایک لا جواب تحریر تھی۔ دلچسپ انداز تحریر تھی۔ بیت بازی میں فہد خان کا شعر پسند آیا۔ پہلی بچ بیانی بڑوں کو دل میں سجدہ کا معجزہ تاک انعام پڑھ کر رونے لگے کھڑے ہو گئے۔ شاید سجدہ کے اس انجام کا ذمہ دار اس کا اپنا شوہر ہی تھا کیونکہ ایک مرد اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کا محافظ ہوتا ہے اور اسلام بھی سختی سے حکم دیتا ہے کہ اپنی عورتوں کو سات پردوں میں چھپا کر رکھو لیکن جب وہی مرد عورت کی آزادی کا قائل ہو تو پھر ایسی ہی دردناک کہانیاں جنم لیتی ہیں جو بے اعتباری، اذیت اور دکھ کا باعث بنتی ہیں۔“

ہذا اعجاز حسین سفھار کا نور پور محفل سے مکتوب: ”تین مہینے پاک سرزمین پر گزارنے کے بعد بخیریت گھر واپس آگیا ہوں۔ خانہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب اور سامنے کھڑے ہو کر اپنے اور تمام احباب کے لیے دعائیں مانگی جن ساتھیوں نے عمرہ کی سعادت حاصل ہونے پر مبارکباد پیش کی ہے میں خلوص دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔ وقت کی کمی اور اپنی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے نظریں، قلمی الف لیلہ، پراکٹر ٹیکس اس بار قدرے خشک مواد ہے۔ ایک تحقیقی بات ہے۔ امید ہے آنے والے ماہ اس کا مادہ ادا ہو جائے گا۔ سراب، کی 84 دیں قسط ہے وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ سات سال گزر گئے لیکن کل کی بات لگتی ہے۔ پہلی بچ بیانی بڑوں کو دل میں سجدہ کے معجزہ کا شہرہ رکھ رہی ہے۔ کسی بھی خوشخوار درندے سے خالی ہاتھ مقابلہ کرنا بے وقوفی میں شمار ہوگا۔ جو لوگ کسی ایسے کام کے لیے اکٹھے ہیں وہی تنقید کرنے والوں کی پہلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ سجدہ کو حد سے بڑھی خود اعتمادی لے ڈوبی۔ سانچہ، میں آفتاب نے جس سچائی سے واقعات بیان کیے ہیں یہاں کسی کی برائی کی نیت نہ تھی۔ البتہ یہ غلطی ضرور ہے کہ ایسے موسم اور چوہین میں مکان میں تنہا نہیں ہونا تھا لیکن وہ اسے اپنا نے کو آما وہ تھے۔ اس واقعہ کو کھیل سمجھ رہے تھے نہ اپنی کامیابی پر نازاں تھے۔ ان واقعات کے تناظر میں نورین کا آگ میں جلتا حادثہ تھا ان کی مرضی کا دخل نہ تھا۔ شاد کٹ، کے سلطان کو حالات نے بچا ڈیا تھا۔ اس کی ذہانت اور مستقبل کی منصوبہ بندی گواہ ہے وہ غیر معمولی بچہ تھا۔ اس کی کاسٹ چھانٹ اور نگہداشت کی جاتی تو معزز شہری بن جاتا۔ بس رمیز سے دیر ہوگئی اور وہ دھوکے میں غلط باتوں میں چلا گیا۔ اپنا خون، میں مناسب طریقہ استعمال کرتے ہوئے نولا وہاں جیسے سر پھرے انسان کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے اپنے شعبے میں انسانی جانوں کو مقدم رکھا جائے تو مخلوق خدا کے ساتھ خود اپنے ساتھ بھی بھلا ہوگا۔ فوبیا، میں عجیب صورت حال سامنے آئی ہے حالانکہ میں نے سعودی عرب میں کئی بار لوگوں کو پون کھنے تک لغت میں سمجھنے دیکھا جو لوہے کا چاروں طرف سے بند کیمین ہوتا ہے لیکن کسی کو بے حال یا گھبراہٹ ہوا نہیں دیکھا اور ان میں زیادہ تعداد ان پڑھ اور دیہاتوں کی تھی۔ وہ ہوش انتظام کے ناقص انتظام پر چیخنے چلانے کے سوا کوئی احتجاج نہ کر سکے۔ خاطر دنیا، خود غرض رشتوں کے کردار کا منہ بولنا ثبوت ہے۔ ہم کیسے معمولی پریشانی کو بھی سر پر سوار کر کے فیشن نے لکھنا چاہتا تھا چھوڑ بیٹھے ہیں لیکن فار یا ہر حال میں خوش رہنے والی لڑکی ہے پھر صحت اور جوش جوانی بھی ہے۔ جب عمر ڈھلے گی، بچوں کی ذمہ داریاں آئیں گی تب شاید سوچیں بے بس کر دیں کیونکہ کوئی حقیقی رشتہ اور ہمدرد قریب نہ ہوگا۔ آج کسی سے اچھے برے کا کا گناہ یا گناہ پورا آنے والے دنوں میں سایہ دے گا ورنہ مصیبت کے وقت دور تک کوئی سہارا نظر نہ آئے گا۔ بھیدی، ایک آئینہ یا پر صرف خیال آرائی دیتی ہے۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ مٹی تازہ ختم ہوا ہے اور چہرے پر چند لحوں کے لیے ہی سہی مسکراہٹ آئی

شہر خیال



ہذا عبدالخالق بھٹی کا سندیر اللہ آباد بہاولپور سے: ”شمارہ اپریل نظر نواز ہوا۔ درویش عالم میں جس طرح مولانا بیسی کو پیش کیا گیا ایسا کہ قبلہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ بہت قابل انسان تھے۔ پاکستان کو ان پر فخر ہے۔ پراسرار پسینا بھی لا جواب تحریر تھی۔ شاعر اعظم پڑھ کر بے ساختہ دل سے شاہد جہاگیر شاہ کے لیے دعائیں نکلیں۔ مٹی کی قبر سے ایک جوہر آباد نکال لائے ہیں۔ بیدل عظیم آبادی کا اب تک نام ساتھ ان کے کلام سے روشناسی نہ تھی۔ اب پڑھا تو تجسس بڑھا اور اتفاق سے دفتر فون کر لیا جہاں سے بیدل لاہوری کا چٹا ملا اور پھر ان لوگوں سے کئی کتابیں منگوا لیں۔ ان کتابوں میں شامل بیدل کے اشعار پڑھ کر چونک گیا۔ علامہ اقبال نے ان کے بے شمار اشعار کو نصیبن کیا یا ہو بیوا اپنی نظم میں شامل کر لیا۔ کئی اشعار تو سو فیصد اردو ترجمہ نظر آئے۔ اتنا بڑا شاعر اور اس وقت کی سیاست اسے کھائی۔ مغل بادشاہوں نے اس کی تصحیح قدر نہ کی۔ جہاں بی بی دلچسپ لگی ویادامنی کو کس لیے شامل کیا کیا سمجھ نہ آئی۔ صفحات کی بربادی تھی۔ قلمی الف لیلہ نے بہت مزہ دیا۔ آفاقی صاحب کو اللہ تعالیٰ عمر خضر عطا فرمائے۔ عمر شریف سوسوچی۔ یہ مجذوب اردو مختصر ہوتے ہوئے بھی ایک اہم تحریر ثابت ہوئی۔ اصلی ہیرہ نے بھی مزہ دیا۔ ترکی لمبی دائم کو اب ختم ہو جانا چاہیے۔ اپریل مطلوباتی مضمون تو ہے لیکن اختصار کی وجہ سے صحیح مزہ نہیں آ رہا ہے۔ سراب کے کیا کہنے۔ بڑوں کو دل کو مٹی میں جکڑ لیا۔ عورتیں جب بہادر بننے کی کوشش کرتی ہیں تو یہی ہوتا ہے۔ ساختہ بھی مزے کی لگی۔ شاد کٹ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اپنا خون سبق آموز رہی۔ فوبیا مجھے پسند نہیں آئی کہ پسند اپنی اپنی۔ خاطر دنیا، بھیدی اور کو چوان گزارے لائق تھی۔ ماہی وطن اس ماہ کی حاصل مطالعہ تحریر تھی۔“

ہذا رانا محمد شاہد پورے والا سے رقم طراز ہیں: ”ادارے میں معراج رسول صاحب نے ایک حساس اور اہم موضوع کا چٹا کیا۔ مختلف تہوار منانے کا مقصد معاشرے میں رہنے والے کئی لوگوں کو مخصوصا غریب لوگوں کو بھی خوشیوں میں شریک کرنا ہے۔ جون کے آخر میں رمضان المبارک آ رہا ہے۔ یہ ہمارا دکھ نہیں الیہ ہے کہ رمضان المبارک کے قریب آتے ہی کھانے پینے کی اشیاء خیرہ کر کے منگی کر دی جاتی ہیں اور عید کے قریب پکڑوں اور جوتوں کی شامت آ جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے ہم صرف اپنے لیے ہی جیتا چاہتے ہیں۔ انوکھی محمد حسین کی ایک مٹی سرگزشت جدوجہد سے بھر پور تھی۔ یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد جاپان میں لوگوں کی اسلام سے دلچسپی بڑھنے لگی۔ فشی محمد عزیز کی صدارت پر تھے، آپ واقعی سرگزشت کے عاشق ہیں۔ میں سردار بانو ناگوری، بشری افضل، طاہرہ گلزار، ڈاکٹر قرۃ العین اور قیصر عباس خان کے ساتھ تمام پڑھنے والوں کا مشکور ہوں جنہوں نے میرے ایوکی صحت یابی کے لیے دعا کی۔ سردار بانو! ایک سپاہی مقبول حسین ہی کیا، ہمارے ہاں تو محسنوں کو فراموش کرنے کی روایت بہت دیر سے چلی آ رہی ہے۔ ہم تو اپنے محسنوں کو مخصوص دنوں میں ہی یاد کرتے ہیں یا ان پر گویا احسان کرتے ہیں۔ مشاہیر پاکستان ہوں یا دفاع وطن کے لیے جانوں کا نذرانہ دینے والے لوگ، انہیں مخصوص ایام میں ہی یاد کیا جاتا ہے۔ بشیر احمد بھٹی کے خط سے یاد آیا آپ صرف کہانیوں یا بچ یا نگوں کا ہی اعزاز دے دیتے ہیں یا حقیقی و مطلوباتی مضامین کا بھی دیتے ہیں؟ (جی ہاں حقیقی مضامین پر اعزاز یہ زیادہ دیا جاتا ہے) میرے خیال میں ناقابل اشاعت کی بجائے قابل اشاعت کا صلہ ہونا چاہیے۔ بشری افضل! صحیح کہا آپ نے دنیا کی سب سے خوبصورت چیز احساس ہے اور انہی بات ہے کہ شہر خیال کے ہاں ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ آفتاب احمد نصیر! دعائیں واقعی زندگی بدل دیتی ہیں۔ انور عباس شاہ، یہ ٹکڑ ڈاک کی یقیناً مہربانیاں ہیں کہ ڈاک بروقت تو کیا کئی دن کی بلکہ مہینوں کے بعد پہنچتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوریز کی درجنوں کپنیاں ہمیں نظر نہ آتیں۔ طاہرہ گلزار! شہر خیال میں خوش آمدید۔ طاہرہ گلزار! چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہم لا تو سکتے ہیں مگر کیسے لائیں؟ ہم جانتے ہیں کہ معاف کرنا بہت بڑی عبادت ہے۔ سبھی کہتے ہیں لیکن جب معاف کرنے کی نوبت آتی ہے تو دل سے نہیں کرتے، جتنی ہم خود اپنے اندر چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں لا کر زندگی کو مشکل بنا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر قرۃ العین! ہمارے اور مغرب کے تعلیمی معیار کے فرق کو تو ایک طرف رکھیں۔ صرف ہمارے ہاں ہی طبقاتی تعلیم میں جس انداز سے فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ کبھی کوئی عام طالب علم ترقی

ہے۔ کوچوان، پڑھنے کے بعد کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کوئی جھکا بھی کسی ڈاکٹر کو انسانی ہمدردی پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ فیس کے علاوہ دواؤں اور خاص طور پر مختلف ٹیسٹوں کے نام پر عوام کو لوٹا جاتا ہے اور دوا کی قیمت پر سیایہ پھیری جاتی ہے۔ گولیاں ڈبی سے نکال کر دی جاتی ہیں یوں من مانی رقم وصول کی جاتی ہے اور بدقسمت مریضوں کی قسمت میں شفا بھی نہیں ہوتی۔ مایوسانہ، کے ایک ایک لفظ سے جب الوطنی، بہادری اور عملی زندگی کی لگن بول رہی ہے پڑھتے ہوئے آخری سطروں تک پہنچتے ہوئے بے ساختہ آنکھیں بھیگ گئیں، واقعی موت زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ جب ایسے جاں نثار جوان اور حوصلہ مند مائیں زندہ ہیں پاکستان کی ایک انچ زمین کی طرف بھی کوئی بری نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ مارچ کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ پاکستان نے اٹلیا کو ہرایا، میں عمرہ کے سلسلے میں مکہ مکرمہ میں تھا تو یقین کریں عربی ہم سے پاکستانی ہونا کفر کرنے کے بعد پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتے اور شاہد آفریدی کو سراہتے۔ ان کی چوہے چٹکوں کی گونج وہاں تک سنائی دیتی رہی اور ہم تمام سامعین غر سے سینہ پھلائے مہرتے رہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ مقامی لوگ بلا ضرورت چاہے کوئی کتنی تکلیف اور مشکل میں ہو، گفتگو نہیں کرتے لیکن پاکستان کی فتح پر ان کی زبانوں کے تالے کھل گئے تھے۔ پاکستان زندہ باد انٹینی محمد عزیز نے مندر صدارت پر فائز ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور لکھاریوں میں بھی شامل ہو گئے ہیں۔ دوسرے ان مارنے پر مبارک باد قبول کریں۔

☆ ڈاکٹر قرۃ العین کا خلوص نامہ اسلام آباد سے "معراج صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کا مشاہدہ ہم سالہا سال سے کر رہے ہیں۔ مغربی اقوام میں کسی کی صرف کلمہ طیبہ کی ہے ورنہ باقی خوبیاں تو انہوں نے اسلام سے ہی لی ہیں۔ برائیاں آپ ان کی اگلیوں پہ گن سکتے ہیں۔ لیکن اچھائیاں بے شمار ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے پاس صرف کلمہ ہے باقی باتوں کو ہم لوگ اہمیت نہیں دیتے۔ پہلوان سلا، میں ان کی کے متعلق یہ سن کر خوش ہوئی کہ وہ مسلمان ہیں۔ فشی محمد عزیز، انور عباس شاہ، طاہرہ گلزار اور حیدر ریاست بھی، آپ لوگوں کا بہت شکر یہ کہ آپ نے شہر خیال میں مجھے خوش آمدید کہا۔ فشی محمد عزیز سرگزشت کے پرانے شمارے کھیں نہیں ملتے۔ میں نے بھی Old book shops کی بہت خاک چھانی مگر یہ رسالے نہیں ملتے۔ میرے تصور میں وہ الماری آ رہی ہے جہاں آپ نے اتنی محنت سے پیدا کردہ جویش شمارے رکھے ہیں۔ ویسے آپ کو مبارک کہ تبصرہ پہلے نمبر پر آیا۔ طاہرہ گلزار آپ کو سالگرہ مبارک۔ مضامین میں درویش عالم ایک بہت اعلیٰ تحریر ہے۔ مولوی عبدالعزیز عین کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر ساجد احمد صاحب سے درخواست ہے کہ آپ ڈاکٹر "ابن میری شمل" جو کہ ایک جرمن اسکالر تھیں کے بارے میں مضمون لکھیں۔ انہوں نے اسلامی علوم پر اپنی انچ ڈی کی تھی۔ قرآن کریم کا جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ آثار قدیمہ پر بھی مضامین شائع کریں، مہربانی ہوگی۔ پراسرار پینٹا، بہت دلچسپ تحریر تھی۔ کسی حیرت انگیز بیماری تھی جس کے بارے میں سائنس بھی کچھ بتانے سے قاصر ہے۔ شاعر اعظم، کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، یاد دہانی، اور مجذوب اردو، بھی اچھی تحریریں ہیں۔ کلید صدیقی نے ہانی دوڑ میں بھی ایک عمر شریف دریافت کر لیا ہے۔ ہمارے لیے تو یہ ایک انکشاف ہے (جبکہ لارنس آف عربیہ کی وجہ سے عمر شریف کا نام زیادہ مشہور ہے)۔ بچ بیانیوں میں بزدل کون، نے روٹنے کھڑے کر دیے۔ ویسے بھی اخبارات ایسی کہانیوں سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ مگر ہم لوگ ان کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے اور سرسری سا پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ سانحہ میں آفتاب نے کمال کی بے بسی دکھائی۔ نورین کو موت کی ویلیر پر کھڑا کر کے مزے سے ایک مینے کے لیے پورے ملک کی سیر کو چلے گئے۔ یہ تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا معاملہ ہے۔ اللہ تو اپنے حقوق تو بہت معاف کر لیتا ہے۔ مگر اس معاملے میں جب تک نورین آپ کو خود معاف نہ کرے معافی نہیں مل سکتی۔ شارٹ کٹ، میں یہ جملہ بہت پسند آیا، جب کوئی چیز اللہ سے منکر کے مانگی جائے اس کے ساتھ آزمائش بھی ساتھ آتی ہے۔ بات تو سو فیصد سچی ہے۔ خاطر دینا، میں قاریا کا کردار دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ بعض لوگ فطرتاً خود غرض ہوتے ہیں۔ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں فطرت کے لحاظ سے مشرق مغرب کا فاصلہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے لوگ بھی خوش نہیں رہتے۔ ویسے کی لکس صاحب نے بہت ہنسیا۔ کوچوان ایک مختصر مگر سبق آموز تحریر تھی۔ فشی صاحب آپ کے دوست کے والد صاحب کے ایک بھٹے نے ڈاکٹر صاحب کی کاپی پلٹ دی۔ ویسے انسانیت کی خدمت کرنے والے ڈاکٹر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کی اکثریت لالچ میں گرفتار ہے۔ دیگر بچ بیانیوں، اپنا خون، فوہیا اور مایوسانہ، درمیانے درجے کی تھیں۔

☆ ناصر حسین کا مکتوب خاص بہاول پور سے "واقعی رجب میں معراج کا واقعہ، شعبان میں شب برات جب فرشتے برات کا پیغام لے کر زمین پر اترتے ہیں اور رمضان المبارک جب شب قدر بھی عظیم رات جس میں مغفرت کی عام منادی کر دی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی معافی چاہے۔ واقعی ہم ان تمام نعمتوں کو پامال کر دیتے ہیں۔ بہت کم لوگ ان تین مہینوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یک مٹی سرگزشت میں محمد حسین دلو کی کا ذکر جس خوب صورت طریقے سے کیا گیا ہے وہ صرف آپ کا خاصہ ہے اور ساتھ میں محمد علی ککے کا ذکر دو عظیم مسلمانوں کا ذکر ایک ساتھ۔ اکرم اور ان کی یادگار رشتی آج بھی ہمارے بزرگوں کو یاد ہے، ان دونوں کی پاکستان سے محبت ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ شہر خیال کی صدارت فشی عزیز نے کو مبارک ہو۔ فشی عزیز نے ایک ٹکٹ، میں دوحے لیے نظر آئے یعنی 60 روپے کی ٹکٹ ایک صدارت کا مزہ اور دوسرا اپنی کہانی کوچوان کا حزمہ۔ عزیز میاں کاش ہم آپ کی اس خواہش کو پورا کر سکتے کہ آپ کو 2012 کے پہلے شمارے کسی بھی قیمت پر درکار ہیں۔ کیا کریں ہم بھی سرگزشت کے اتنے عاشق ہیں جتنے کہ آپ۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، کسی زمانے میں آپ صرف آفتاب احمد نصیر لکھا کرتے تھے۔ آپ کے خط سے

واضح ہوا کہ آپ اشرفی کیوں لکھتے ہیں ہمارا تہمتس بھی دور ہوا۔ ڈاکٹر قرۃ العین، روجوں کے شکاری آپ کو بہت پسند آتی۔ اور یہ پڑھ کر بہت اچھا لگا کہ آپ کو ہماری طرح پراسرار کہانیاں پڑھنے کا بے حد شوق ہے، ویسے روجوں کے شکاری میں شیطان روجوں کو قید کر لیتا ہے۔ اگر اس بات کا تہمتس کسی قاری کو ہو کہ وہ روجوں سے کیا کرتا ہوگا تو وہ فلم Haunted دیکھے۔ کافی سارے قارئین پراسراریت نمبر کا نمبر سے تقاضا کر رہے ہیں۔ کچھ کو تو معلوم بھی نہیں کہ پراسراریت نمبر 1 اگست 2011 اور پراسراریت نمبر 2 جنوری 2012 کو شائع ہو چکا ہے۔ پراسراریت نمبر 2 تو ہمیں اس قدر پسند آیا تھا کہ ہم نے اس کی دو عدد کاپیاں خرید کر رکھ لی تھیں۔ ایک سنبھال کر رکھنے کے لیے دوسری پراسرار کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے۔ ڈیڑھ حیدر ریاست بھی۔ آپ کے خط سے لگ رہا تھا کہ ابھی تک آپ پر صدارت کا انشہرہ باقی ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ ہر مہینے صدارت کرنے والے کی تصویر خط کے ساتھ شائع کی جائے جس کا فاصلہ سال کا بہترین خط ہو اس کا ایک مٹی تعاری صنف ہونا چاہیے۔ ویسے خاص نمبروں کے بارے میں آپ کی تجویز کتاب نمبر اور سائنس نمبر زیر دست آئیڈیا ہے۔ فطرت علی نے لکھا ہے کہ سرگزشت صرف مایوسانہ اور علی حد تک محدود ہو۔ اگر ان کی اس تجویز پر عمل کر دیا جائے تو سرگزشت کا نام بھی معاشرتی علوم رکھنا پڑے گا۔ ملک جاوید خان سرکانی درانی آپ کی آمد کی انتہائی خوشی ہوئی۔ ویسے ہماری تجویز کا خیر مقدم کرنے کا بے حد شکر ہے۔ پراسرار پینٹا، کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ شاعر اعظم، ہمارے سرگزشت کے سامنے شہنشاہ جہانگیر سوری جب شاہد جہانگیر شاہ کی انتہائی محنت سے لکھی گئی تحریر تھی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی۔ اگر اس تحریر کا نام شاعر اعظم کی بجائے شاعر دی، ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔ (ہند میں فارسی شاعری میں بیدل کا جتنا نام ہے اتنا کسی اور شاعر کا نہیں۔ کراچی میں بیدل لاہیری جو پاکستان بھر میں پڑچوں کا سب سے شاعر کلکیشن رکھتی ہے انہی کے نام پر ہے) یاد دہانی، بدر الدین عظیم آبادی کی ماضی کی یادوں سے بھی انتہائی پر فکر تحریر تھی۔ فشی الف لیلہ میں عظیم اداکار دیپ کمار، ایتا بھجن اور شاہ رخ خان کے اسٹریو کے ساتھ ان کی یادگار تصویروں کا ذکر بھی پسند آیا۔ عمر شریف کی سرگزشت کلید صدیقی کی عمدہ تحریر تھی۔ ہم نے عمر شریف کی صرف ایک نمود و رنگی ہے 10,000 بی، ہی جو یادگار اور تاریخی موی ہے۔ مجذوب اردو، محمد ایاز راہی صاحب یک دوری تحریر میں سعادت حسن منٹو کو خراج تحسین پیش کرتے نظر آئے، بہت اعلیٰ تحریر ہے۔ اپریل! منظر امام کا ہماری معلومات میں اضافہ کرنے پر بے حد شکر ہے، بچلے دنوں نفسیاتی اور اس مہینے فوہیا بھی تحریر شائع کر کے معلومات میں اضافہ کیا کہ اس طرح کے لوگ ہمارے معاشرے میں رہ رہے ہیں اور انہیں پتا بھی نہیں ہوتا۔ آگاہی کا بے حد شکر ہے، اور یہ سرگزشت کا خاصہ ہے۔ مایوسانہ اور بزدل کون اچھی تھی۔ جنوری 2014 میں ہم نے پراسرار تحریروں کی فہرست لکھی تھی جون میں اکتوبر 2012 کی ایک زبردست سچی پراسرار تحریر یادیدہ عشق، میری فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئی تھی۔ پراسرار تحریریں پسند کرنے والے نوٹ فرمائیں۔ عبدالحق بھٹی کا مختصر نامہ؟ رانا سجاد اور نصیر عباس باہر کہاں کھو گئے ہیں۔

☆ محمد اشفاق کا خلوص نامہ سرانے عالمگیر سے "شروع سراب، سے کیا۔ میری نظر میں یہ کہانی دیوتا، موت کے سوا گر، بازی گر، شکاری اور تاوان کے بعد بہترین کہانی ہے۔ امید ہے اگلی قسط میں ہیرو وادی کی جانب روانہ ہو جائے گا۔ آپ نے ابن سید دو گنگہ یونگہ کے سوال کے جواب میں کہا ہے کہ سرباب اگلی کتابی شکل میں شائع نہیں ہو رہی، پھر کب ہوگی؟ (کتابی صورت میں دوسرے پبلشر شائع کرتے ہیں اس لیے جواب دینا مشکل ہے) دوسری بات پہلے کتابیات بلی کیشن والوں کا اشتہار شائع ہوتا تھا جس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ کون سی سلسلے وار کہانی کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ مہربانی فرما کر ان کا اشتہار دوبارہ شروع کریں (اشتہار دیں گے تو ضرور شائع ہوگا) اب انا ڈی کے بارے میں آپ نے ابن سید صاحب کو بتایا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ وہ کتابی شکل میں شائع ہو گئی ہے۔ ایک ضروری درخواست یہ کرنی تھی کہ سرباب کو کتابیات بلی کیشن والوں سے کتابی شکل میں شائع کروائیں۔ بچ بیانیوں میں بزدل کا نام بزدل کون نہیں ملکہ یہ توقف کون ہونا چاہیے تھا۔ عرفان اور سعد یہ صرف یہ توقف نہیں تھے بہت بڑے یہ توقف تھے۔ سعد کا جو مشہور اکرانہ ہوتا تو حیرت ہوتی۔ آخری بچ بیانی مایوسانہ، بہت اچھی رہی۔ ایک تجویز ہے کہ اگر ہر سال اگست میں صرف اس ٹاپ کی بچ بیانیوں شائع کی جائیں کہ یہ ملک کیسے حاصل کیا گیا تھا تو نئی جزیں کو بھی معلومات پہنچتی رہے گی۔ کراچی کے فطرت علی نے انتہائی احتیاط تجویز پیش کی۔ جس طرح کا ادبی رسالہ فطرت علی صاحب چاہتے ہیں، وہ بے شمار شائع ہو رہے ہیں۔ آپ نے خوب بات کی کہ آپ کی فرمائش اعلیٰ ہے، یہ اعلیٰ فرمائش ہے؟ معراج رسول صاحب نے اپنا خون دے کر جو رسالہ شائع کرنا شروع کیا تھا اس کا یہ افرق کرنے کا خیال تھا (ہمارے لیے ہر قاری کی بات اہمیت رکھتی ہے اور ہر ایک کی بات کو ہم سمجھتے ہیں) ڈاکٹر قرۃ العین نے اسلام آباد سے خوب سہ سہ سہ سہ، اگر آپ کو پراسرار کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سرگزشت والے ہر ماہ پراسرار نمبر شائع کریں۔ کچھ عرصہ پہلے تو خاص نمبر شائع ہوئے تھے۔

☆ قیصر عباس کا نامہ خلوص بھکر سے "مہنگائی، قوی یا کمزوری تہواروں پر ہو جانا عام کی بات ہے، گندم 2800 کی بڑی مشکل سے کچی رہی تھی اور اب تک ریت 4200 کا ہے۔ نئی گندم 15 اپریل کے بعد آجائے گی۔ ریت حکومت پنجاب نے فکس نہیں کیا۔ فشی محمد عزیز نے صاحب کو صدارت مبارک ہو۔ آئی سورہہ بانو کا تبصرہ اچھا لگا اور بشری افضل آئی، آپ کو کس نے کہا کہ آپ غلط کہہ سکتی ہیں۔ آپ کے تبصرے کیونکر بھی دوبارہ چھاپ دیتا ہے، ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ نے انچ ڈی فرسک ہیں، اچھا لگا کہ ڈاکٹر روبینہ نے انصاری کی طرح ایک اور ڈاکٹر ہمارے درمیان ہیں تبصرہ اچھا پڑھنے کو ملے گا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، انور عباس شاہ، بھکر رانا محمد شاہد کے علاوہ سب کے خطوط اچھے تھے۔ سب کو میرا سلام۔ آئی طاہرہ گلزار صاحبہ کو بہت بہت مبارک باد، اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے، کافی عرصہ کے بعد حاضر تھیں لیکن مزید ان لوگ جو کہ کے ساتھ

بھر پور تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ وحید ریاست صاحب ہماری رائے اور ہر کوئی پسند نہیں آتی لیکن خوشی کی بات ہے چھپ گیا۔ عمران صاحب نے جس اور ڈاکٹر صاحب کا تاخیر میں بھی نام نہیں تھا۔ اور ساتھ میں تو حیدری صاحب بھی شامل نہیں جو کہ اپریل کے شمارے کو پیکا کر گیا۔ سب سے لکھنے والے بہت اچھے خطوط سے حاضر تھے اب کہانی سے پہلے عمر عامر ساحل سے التجا ہے، لگتا ہے وہ پھر غصے میں آگئے ہیں جو کہ ہمیں مایوس کر گئے۔ اللہ کرے خیریت سے ہوں آمین، کہانیاں اچھی تھیں ساری کی ساری۔“

☆ بشری افضل کی بہادر پور سے تشریف آوری ”انگل جی کی باتیں سن کر تو تمام صورتحال کا پتا چل جاتا ہے۔“ پہلوان مسلح“ پڑھ کر بہت کچھ معلوم ہوا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو منشی محمد عزیز کو کرسی صدارت پر ڈالے پایا، بہترین تبصرہ تھا۔ اعجاز حسین۔ شمار دو بارہ خدا کے حضور حاضری مبارک ہو۔ خوش قسمت ہیں آپ اور خدا آپ پر ہر بان ہیں۔ ڈاکٹر روینہ خوش رہیں۔ شیر احمد بھٹی ہمارے شہر کے ہی ہاکی ہیں۔ مظہر سلیم کہاں غائب ہیں۔ آپ کی غیر حاضری لگ گئی۔ ڈاکٹر قرۃ العین کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ بیچ انگلش میں تیز ہو جاتے ہیں اور مادری زبان میں کمزور۔ وحید ریاست بھٹی کو ہم سے بڑی شکایت ہے لیکن میں ان کی بات سے متفق ہوں کہ انگل معراج نے زندگی میں اتنی محنت کی ہے کہ چار چار میگزین ان کا نام چلا رہے ہیں۔ ان کی عظمت کو سلام پیش کرتی ہوں۔ رانا محمد شاہد کٹر کے دھکن بھی اب تو چوری ہونے لگے ہیں۔ اتنی مہنگائی جو ہو گئی ہے۔ چوہدری اختر حسین نے خاصا مطلوباتی تبصرہ لکھا ہے۔ اچھا لگا۔ کچی کہانی پیش خدمت ہے، اگر قریبی اشاعت میں جگہ ملے تو حوصلہ افزائی ہوگی (اس پر سچے سے فارغ ہو کر دیکھ لیتا ہوں)۔ ”اپنا خون“ لکھنے پر بڑے خوبصورت اعزاز میں ڈرائیور کو عملی قدم اٹھا کر غلطی کا احساس دلایا اور ہلکے ہلکے اعزاز میں سمجھا بھی دیا۔ یہ نیکی ہے۔ فوہیا، شہر یار کے ضمیر نے اس کو معجزہ دیا کہ قتل جیسا جرم کر کے کیسے جی سکتا ہے۔ اگر جرم کا اقرار کر لے تو صحت کی طرف لوٹ جائے۔ کوچان میں ڈاکٹر کی آنکھیں ایک کوچان نے کھول دیں کہ وہ کس طرح لوگوں کو لوٹ رہا ہے۔ قلمی الف لیلا میں کافی معلومات تھیں بیت بازی میں تمام اشعار معیاری تھے۔ زاہد حیات کا شعر بہت خوب تھا ترکیبی نام، مگر بیٹھے ہی ترکیبی کی سیر کردادی بزدل کون میں صحت کا پہلو نہیں تھا عرفان اگر دیکھ کی بات مان لیتا تو یوں زندگی بھر نہ روتا اور نہ ہی بچوں کی ماں غائب ہوتی۔ سلطان نے شارٹ کٹ کا راستہ اپنا کر غلط کیا۔ اگر ایک اور اتوار انتظار کر لیتا تو یہ قدم اٹھانے پر مجبور نہ ہوتا۔ رمیز کو اور اس کی بیوی کو نیک نیتی کا پھل مل گیا، خدا نے ان کی دعا سن لی۔ خاطر دنیا، میں ماریہ نے بہن کی خاطر قربانی دی۔ ماریہ کو خدا نے اس کی نیکی کا ایسا اجر دیا کہ اب خوش و خرم اپنے گھر میں آباد ہے۔“

☆ محمد عمران جوٹانی کا تبصرہ کراچی سے ”تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد بندہ حاضر ہے۔ سب سے پہلے معراج صاحب کی آواز میں آواز ملتا ہے ہوتے ہم بھی یاد دلانا چاہیں گے کہ مہنگائی کے ساتھ ساتھ برکتوں کے مینے آ رہے ہیں، کمر کس کر ٹو اب کمانے کے لیے تیار ہو جائیں کہ اگر کئی گنا بڑھ جائے گا۔ اسلام کی قدر وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں جو سوچ کچھ مطالعہ کر کے ایمان لائے اور ان کا اسلام لانا لاکھوں کی ہدایت کا سبب بنا، انوکھی کی موجودہ تبلیغ کا دشمن ہاں کی کوکھ سے مسلمان پیدا ہونے والوں کے لیے لمحہ فکریہ ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد! اس مرتبہ آپ پورے جون پر نظر آئے، علامہ یحییٰ سے متعلق تحریر کا مطالعہ عصر حاضر کی اہم ضرورت ہے، انسان چاہے تو اس مختصر زندگی میں کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ میں خود بھی سین ہوں اپنے بزرگوں سے کٹھنیا واڑ، گجرات، اچکوت وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، وہی باتیں دوران مطالعہ ذہن میں گھومتی رہیں۔ سسرالی جھگڑے مسنون میں نسبتاً زیادہ ہیں۔ میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی کہ والد کی زندگی کے آگے بیوی کو طلاق دینا پڑی۔ علی گڑھ میں حضرت کے مکان سین منزل، وہاں کے معمولات، اوقات کی پابندی اور وفاداری بیوی کے ذکر نے دل خوش کر دیا۔ شاعر اعظم شاہد جہانگیر شاہد کا ایسا شاہکار ہے کہ اس پر دو لفظ لکھنا بھی بھاری ہے۔ نہایت گہرائی کے ساتھ تحقیق کر کے حقیقت و خلوص کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے، ہم خوش قسمت ہیں کہ شہر خیال میں ان کی رفاقت نصیب ہوتی ہے۔ جب کوئی صاحب طرز بزرگ اپنا ماضی کریدتا ہے تو سنتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس نہیں رہتا۔ اس ضمن میں یوسفی صاحب کی زرگزشت اور آفاقی صاحب کی تحریریں مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ یاد ماضی، سید بدر الدین صاحب کا لہجہ مزہ دے گیا۔ منشی صاحب کے دوست کی کہانی کوچان، اچھی کوشش ہے۔ مولا کب کسی کے ایک پتلے سے ہدایت کا سامان کر دے وہی جانتا ہے۔ بزدل کون نے دل بوجھل کر دیا۔ بہادر وہ ہے جو اپنے غصے اور جذبات پر قابو رکھے۔ سوچ کچھ کر قدم اٹھائے۔ وقت اور صلاحیتوں کا درست استعمال جانتا ہو۔ اللہ سعد یہ بھائی کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، انسانی تاریخ ایسی ظلم و بربریت سے بھری پڑی ہے۔ مولا طارق جمیل صاحب درست فرماتے ہیں کہ ہمارا امیر بھی ظالم ہے اور غریب بھی، بس جس کا داؤ چل جائے۔ منشی محمد عمنے کے لیے اپریل 14 کا شمارہ یادگار رہے گا۔ کرسی صدارت، ایک شعر اور کوچان ساتھ ساتھ، پورا شمارہ بڑی خوبصورتی سے Cover کیا۔“

☆ وقار الرحمن نے لاہور سے لکھا ہے ”شب عروسی کی ایک ناقابل فراموش ناقابل یقین داستان جس اسرت نے میری زندگی میں زہر گھول دیا، وہ دردی رات کی صورت میں پیش خدمت ہے۔ قبول کیجئے۔ (پر سچے سے فارغ ہو کر پڑھ لیں گے)۔“

☆ ملک رحمت کا خط میا نوالی سے ”میں تقریباً 6 سال سے سرگزشت کا باقاعدہ قاری ہوں اور پرانے سرگزشت کی تلاش میں رہتا ہوں۔ مجھے سرگزشت جیسا رسالہ دوسرا نہیں ملا، آپ ایسے مضامین شائع کرتے ہیں کہ جو کہیں اور ہی نہیں سکتے۔ خطوں کی محفل مجھے بہت پسند ہے اس بار منشی محمد عزیز

میں نے کے لیے دو خوشیاں تھیں ایک کرسی صدارت اور دوسری کہانی کا شائع ہونا۔ بہت مبارک ہو۔ میری بھی عادت آپ سے ملتی ہے کہ میں بھی بہت بڑے خرچ کر کے پرانے شمارے تلاش کرتا ہوں۔ طاہرہ گلزار صاحب آپ تو اپریل فول ہوئیں 2014-4-1 بہر حال سالگرہ مبارک ہو۔ آپ نے اپنی عمر بتادی ہمارے لیے اور قابل احترام ہو گئیں آپ۔ انگل ایک موضوع میرے ذہن میں بھی ہے خاص نمبر کے لیے ”تیزاب گردی“ میں ایک کہانی بھی ساتھ بھیج رہا ہوں جواب ضرور دیں۔ ویسے آپ جلد ہی کوئی خاص نمبر پیش کریں۔ مجھے بھی الدین نواب اور احسان اقبال کی اپنی سرگزشت پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ مجھے پتا ہے کہ منشی الدین نواب صاحب کی سرگزشت شائع ہو چکی ہے مگر تلاش کے باوجود وہ شمارہ آج تک نہیں مل سکا۔ پلیز ہماری درخواست پر سوچنے کا ضرور۔ میں سب سے پہلے جج بیایاں پڑھتا ہوں، اس بار بزدل کون پہلے نمبر پر رہی پھر شارٹ کٹ اور تیسرے نمبر پر خاطر دنیا، چوتھے پر فوہیا اور پانچویں نمبر پر کوچان۔ بعد ہی جانے کیوں حقیقت سے ہٹ کر گئی۔ پر اسرار بیٹا دل و دلا دینے والی تحریر تھی اور آخر میں تو ہماری بھی جان نکال دی رائٹر نے یہ کہہ کر کہ یہ بیماری دوبارہ بھی آسکتی ہے۔ اللہ پاک سب کو حفظ و امان میں رکھے آمین۔ قلمی الف لیلا کو ابھی زیادہ عرصہ جاری رہتا جائے۔ قلمی الف لیلا میں بتائے گئے پرانے گانے میں انگریزیت پر تلاش کر کے سنتا ہوں۔ سراب میری پسندیدہ تحریر ہے۔ میں سرنائے نہیں پڑھتا لیکن ترکیبی نام شوق سے پڑھتا ہوں اعزاز خیر اچھا ہے۔“

☆ محمد عارف قریشی نے بھکرے لکھا ہے ”میں چھوٹا سا تھا تاہم میری یادداشت میں ہے کہ ان دنوں کراچی سے رخ شیخ نامی ایک صاحب ”سرخ رساں“ کے نام سے ایک ماہنامہ نکالتے تھے۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ موصوف آپ کے والد محترم تھے۔ عبدالغفار شیخ، ایسا ہی ہے نا؟ آپ نے اپنے والد کی میراث کو جس احسن طریقے سے سنبھالا، اس کے لیے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس دور میں چار رسائل باقاعدگی سے شائع کرنا مجھے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن آپ نے دودھ کی یہ نہر نکال ہی لی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ سرگزشت، کے حالیہ شمارے اپریل 2014 میں دریا خان ضلع بھکر کے ایک قاری انور عباس شاہ نے شکایت کی ہے کہ معروف گلوکار مجیب عالم جن کا تعلق بھکر سے تھا، کے بارے میں سرگزشت میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ماہنامہ سرگزشت کے شمارہ جولائی 2007 میں علی سفیان آفاقی صاحب نے اپنے سلسلہ وار مضمون قلمی الف لیلا میں مجیب عالم مرحوم کے متعلق خاصی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ شاید یہ شمارہ ان کی نظر سے نہیں گزر رہا ہو انہیں سرگزشت سے یہ گھنہ نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں راقم الحروف کی مرتب کردہ ایک کتاب مشاہیر میا نوالی، بھکر، کے نام سے عنقریب منظر عام پر آ رہی ہے جس میں مجیب عالم کی شخصیت اور فن پر مضمون شامل ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے ان کا یہ شکوہ یقیناً دور ہو جائے گا کہ مجیب عالم ہمارے ہی علاقے کے تھے اور ہم ہی ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔“

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی لاہور سے رقمطراز ہیں ”سرگزشت عالمی جریدہ ہے اور اس میں شائع ہونے والی تحریریں پہلے شہری انداز میں ہوں لیکن کبھی کبھی اس کا انداز شاعرانہ ہو جاتا ہے۔ منظر امام کے اپریل میں بہت کچھ تھا لیکن میں اپریل کا شمارہ کسی عالمی مشاعرے کی طرح لگا جس میں شائع ہونے والے مواد پر داد دینے کو دل چاہنے لگا۔ چیف صاحب کا سپاس نامہ ہماری اجتماعی بے حسی کا شاخسانہ تھا۔ قوی و فدا ہی تہواروں پر مجاشی لوٹ مار پر جناب رضی اختر بھی آپ کے ہم خیال ہیں، کہتے ہیں کہ ”کیسے کئے قصیدہ گو حرف وروں کے درمیان، کوئی تو سرکشیدہ ہوا تھے سروں کے درمیان“ درویش عالم کی عربی زبان پر کی گئی عرق ریزی اور عالم عرب کی پذیرائی کے باوجود ہماری بے حسی پر مہر بھوپالی کا یہ شعر حسب حال ہے کہ ”اپنے پرکھوں کی وراثت کو سنبھالو ورنہ اب کے بارش میں یہ دیوار بھی گر جائے گی۔“ ہماری یادداشت کے نہاں خانے میں موجود کئی اعلیٰ صاحب کا یہ شعر کہ ”پتے لاد کو کھولز میں کی جھپیں۔ میں کہاں دن ہوں کچھ پتا تو چلے۔“ شاعر اعظم مرزا عبدالقادر بیدل کے لیے ہے جن کا حرار مبارک حادثات زمانہ کی نذر ہو گیا۔ شاہد جہانگیر شاہد نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کراہت نما کوشش کی ہے جس کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ شہر خیال کا یہ عجیب بھی روچنے نہیں انصاری صاحب کی طرح تراش کر آپ نے ہیرا بنادیا، بالکل محمد ایاز راہی کی طرح جن کے مجذوب اردو کی شان میں بھارت کے جناب کور مہندر سنگھ بیدی کا یہ شعر کافی ہے کہ ”صاحب ایمان نمائش کیوں کریں ایمان کی۔ آؤ ہم انسان ہیں باتیں کریں انسان کی۔“ سعادت حسن منٹو ایک انسان ہی تھا۔“

☆ منشی محمد عزیز مینے نے لڈن دہاڑی سے لکھا ہے ”حاصل پور فون کیا۔ بک اسٹال والے کا جواب اثبات میں پاکر فوراً لاری اڈے کی طرف لپکا اور یوں انکس مارچ کے روز پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق پندرہ بج کر چھ منٹ اور بیالیس سیکنڈ پر سرگزشت کا چھاپہ، میرے ہاتھوں کے ایئر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ اشتهارات سے بھلو ہائے کرتے ہوئے پیارے انگل معراج رسول کے ادارے تک پہنچے۔ بہت شکریہ انگل جی! ہوشیار کرنے کا لیکن غریب بچارے کریں تو کیا کریں۔ ان دنوں یہ حالت ہے کہ ادھر آٹا نایاب ہو چکا ہے اور بلیک میں مل رہا ہے۔ دو ہزار روپے فی من کے حساب سے۔ رمضان شریف میں تو خصوصی بیچ ہو گا ناں یعنی ہر چیز ذیل رعیت پر ملے گی کیونکہ ہم ہیں پاکستانی مسلمان، سرشرم کے مارے جھک جاتا ہے ایسی باتوں پر۔ کاش ہم تھوڑا سا بھی اپنے گریباں میں جھانک لیں کہ ہم کیا سے کیا ہو کر رہ گئے ہیں۔ پہلوان مسلح میں انوکھی محمد حسین کی عظمت و شجاعت کو سلام۔ ہانچے کا پتہ شہر خیال تک پہنچ ہی گئے ہیں لیکن پہلے ایک چھوٹی سی بات بلکہ اسے چھوٹی سی نہیں کہنا چاہئے۔ شہر خیال میں خلاف توقع مجھے ناواقف کو زبردستی اٹھا کر کرسی صدارت پہ بٹھا دیا گیا۔ اس خوشی سے مرنے جاؤں اسے خدا اول پہ ذرا ہاتھ رکھ دیں کہ دھڑکن معمول سے بہت تیز ہو چکی ہے۔ آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔ آپ کی اس ذرہ نوازی پر۔ شہر خیال میں جنوری کے شمارے میں سولہ میل

چار فیصلہ خطوط، فروری میں تیرہ + تین (یعنی تین میں تیرہ میں والا محاورہ کا بالکل الٹ) مارچ میں سترہ، چار اکس خطوط شامل تھے جبکہ اپریل کے شہر خیال میں نہایت مختصر مگر تعداد میں زیادہ یعنی اٹھارہ + آٹھ کل چھپس خطوط شامل تھے۔ درویش عالم محترم عبدالعزیز مبین یہ خوب لکھاؤ اکثر صاحب نے۔ ویسے ایک بات کا انفسوس ہوا کہ آج کل کے جابلوں کی طرح عزیز صاحب کے والد محترم نے بلاوجہ جنگی کو طلاق دلائی۔ گویا شریک والی بات بہت پرانی ہے آج کی نہیں۔ پراسرار پینٹا این بکیر کی یہ تحریر پڑھ کر بے اختیار استغفر اللہ پڑھنے لگا۔ اللہ محفوظ رکھے ہر قسم کی زمینی و آسمانی آفتوں بلاؤں سے۔ شاہد جہانگیر شاہ نے شاعر اعظم کے عنوان سے حسرت بیدل پر بہت خوبصورت اور معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ میرے مرشد فرماتے ہیں کہ عربی زبان اللہ تعالیٰ کی ہے اور فارسی اولیاء اللہ کی زبان ہے۔ سبحان اللہ۔ شاہد صاحب آپ کو ہم خصوصی طور پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ عمر شریف ہم تو سمجھے تھے پاکستانی اداکار کا تذکرہ ہے لیکن یہ کوئی مصری نژاد ہیں ہالی وڈ کے اداکار۔ ان کے غصے پر حیرت ہوئی۔ حالانکہ شوہر والے عموماً تحمل مزاج ہوتے ہیں کم از کم ظاہری طور پر۔ مجذوب اردو پڑھ کر لاہور جانے کی میری خواہش سوا ہو گئی ہے۔ (خط مختصر اور جامع ہوتا دیگر احباب کو بھی جگہ مل جاتی ہے۔)

عزیز اللہ کی آمد لکھتے ہیں "محترم معراج رسول آپ کا بہت بہت شکر یہ آپ نے ہمیں خبردار کیا۔ مہنگائی کا مغرب آج بھی پورے جوہن پر ہے، ہفتہ 100 روپے کلو، آٹہ 60 روپے کلو، گوشت اور مچھلی؟ ہماری ایسی شکل کہاں۔ طاوت شدہ کاروبار پورے عروج پر ہے۔ غریبوں کا کچھ پہلے ہی کھل گیا ہے۔ آنے والی خوفناک مہنگائی کا سن کر ہمارا ناک دل ٹوٹنے ٹوٹنے ہوا جاتا ہے۔ تاجروں خدا کرے ہمیشہ خسارے میں رہو۔ شہر خیال میں سب بھائی بہنوں کے تیرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے بس ایک خرابی ہے گھما پھرا کر مہنگائی کا رونا روئے لگتے ہیں۔ پہلی بج بانی بڑوں کون پڑھ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لہسن کا قصور کیا تھا۔ اپنے پیارے شوہر سے ملنا پر ویش میں گناہ تو نہیں۔ دشمنوں سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں لہسن کا کل پولیس کے گندے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ ثبوت منانے کے لیے ڈیڈ باڈی کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ چائلہ و ماخ و عدو، وقت کی کا دوست نہیں ہوتا۔ دوسری بج بیانی سانحہ کے آفتاب احمد تک حرام۔ جس گھر کا ملک کھایا اس گھر کی مصروفی کی عزت کوئی، خود کو مظلوم سمجھتا بند کر دے۔ رحم کی اپیل بھی کر دے۔ عمر قید کی سزا تجھے ضرور ملنی چاہئے۔ نورین کی جدائی کی آگ میں جلتے رہو۔ حور شکیل لہسن، پری ویش نورین خدا آپ دونوں کو جنت الفردوس میں جگہ دے آئیں۔ تیسری بج بیانی شاد کٹ پڑھ کے جذبات کے آخری اسٹیج پر پہنچ گیا۔ ریمز انصاری آپ کو ایک بکھر چھٹنے والے افغانی لڑکے میں ایسی کیا خاصیت نظر آئی۔ یقیناً آپ کو بے اولاد ہونے کا شوق سے احساس ہوا ہوگا۔ وقت ضائع کیے بغیر سلطان کو ترس کھا کر اپنے گھر لائے۔ چنگ آپ کی نیت صاف تھی۔ ریمز انصاری، مہربان ہونے کی بھی حد ہوتی ہے۔ آپ مولانا عبدالستار ایدھی، انصار برنی تو نہ بن سکے لیکن قائل ضرور بن گئے۔ لیکن وہ جیم پچر جاتے جاتے آپ کی آخرت سنوار گیا۔ آپ کو بچہ پالنے کا شوق تھا تو قمر علی جاتے جاتے جہاں حکومت کی بے حس کی وجہ سے 200 پھول پیسے بے اس عالم دنیا کو ترک کر گئے۔ بے شمار جانور بھوک اور پیاس سے مر گئے۔ ان سب کا خون پاکستان کی 20 کروڑ آبادی پر ہوگا۔ قیامت کے دن یہ مصوم بچے اللہ تعالیٰ سے پوچھیں گے یا اللہ تیری دنیا میں ہم بھوکے پیاسے مر گئے ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔"

ڈاکٹر خالد شفیع ملک بھکر سے لکھتے ہیں "اپریل 2014 کا سرگشت میں جتنے بھی مضامین ہیں بہت ہی اعلیٰ اور فصاحت آموز ہیں۔ سرگشت علم و ادب کی یونورسٹی ہے۔ لوگوں کے تجربات سے ہمیں آگاہی ہوتی ہے اسی طرز کے مضامین پر پرنٹ ہوتے رہے تو ہمارے لیے مشکل راہ ہیں۔ اور وطن کی آپ جتنی بہت ہی دکھ بھری کہانی ہے۔ قلمی الف لیلہ ماضی کے جھروکوں سے لیا گیا معلوماتی تحریر ہے۔"

ہلالہ انور عباس شاہ حور یا خان بھکر سے رقمطراز ہیں "سب سے پہلے آپ کی صاف اور کمری باتیں یا نصیحتیں پڑھنا نہیں بھولے لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہم کس کس بات سے ہوشیار رہیں۔ مگر توڑ مہنگائی، قتل و غارت، لوٹ مار اور خود کش جملے جیسی چیزیں ہمارے ملک میں عام ہو چکی ہیں۔ خدا ہم سب کو ان مصیبتوں سے محفوظ رکھے آئیں، بھائی بہنوں کے تیرے بھی خوب تھے۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ کا خط پڑھ کر یاد آیا کہ میں نے بھی پچھلے خط میں آپ سے گزارش کی تھی کہ ایک اور پراسرار نمبر ضرور نکالیں کیونکہ مجھے بھی حقیقت پر مبنی پراسرار کہانیاں پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ ریمز انصاری کی بج بانی ایک اچھی کاوش تھی۔ سلطان جیسے کردار اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور اسی قسم کا سلسلہ نہ جانے کب تک چلا رہے گا۔ ہمیں ان جیسے کرواروں سے بھی تو ہوشیار رہنا چاہئے۔ فشی عزیز مئے کی تحریر کو چوان بھی بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک کو چوان سے سبق حاصل کیا اور راہ راست پر آگئے۔ یہ بھی بڑی بات ہے۔ فشی صاحب کی تحریر پڑھ کر اعزاز ہوتا ہے کہ صاحب لکھ سکتے ہیں۔ خداوند کریم ان کو کامیابی عطا فرمائے (آمین)۔ یاد ماضی کی کردار خالد جیسی خاتون کا رویہ ہم انزم میں نے تو اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھا۔ ترکی کی وائٹ تو دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی جا رہی ہے۔ اصلی ہیرو، بھی ایک خون گرمادیے والی تحریر تھی۔ جم نے واقعی ہیرو بن کر دکھایا اور اسے انسانوں کی جان بچائی۔ جہاز جتنی ایک نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور تحریر تھی۔ قلمی الف لیلہ کا سلسلہ بھی ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور معلومات سے بھرپور تھا۔ گراموفون کے متعلق مختصری معلومات، بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ہمارے بچپن کے دور میں تو خیر سے یہ توڑ پھٹا تھا۔ فیش ریکارڈ ہی صرف جیتے تھے۔ اب تو فیش ریکارڈ بھی قلم ہو رہے ہیں کیونکہ آڈیو کیسٹس کی کمپنیاں اب تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ اب ان کی جگہ کارڈز آگئے ہیں۔ ایک ہی کارڈ میں نہ جانے کتنے گانے اور فلمیں سما سکتی ہیں۔ اب آئیڈو نہ جانے کیا کیا ہوگا۔ پھر حال جو بھی ہو ہماری ثقافت، ہماری تہذیب ختم نہیں ہونی چاہئے۔ ترقی کے تو بہت راستے ہیں۔ خوفناک تحریر پراسرار پینٹا نام کی طرح پراسرار تھی۔ درویش عالم اور شاعر اعظم بے مثال تحریر تھی۔ شاعر اعظم

کے معصوم کو مزید تحریر بھیجتا چاہئے۔ بیت بازی کا سلسلہ میں نہیں پڑھتا کیونکہ شعر و شاعری سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ قسط وار کہانی سرب اچھی جا رہی ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر اس کی اگلی قسط کا ہمیں شوق سے انتظار رہتا ہے۔ منظر امام صاحب کی ماہ اپریل کے بارے میں معلومات بھی خوب ہیں امید ہے یہ سلسلہ دسمبر تک اسی طرح دلچسپ اور مفید معلومات سے مزین چلتا رہے گا۔"

عزیز اللہ خان گندہ پور ڈاکٹر اسامہ علی خان سے رقمطراز ہیں "آج سے تقریباً دو سال پہلے شہر خیال کے دروازے پر دستک دی تھی۔ اب یہ کوشش ہوئی کہ ہزار لکھوں کیونکہ قاری جو اتنا پڑھتا ہوں۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ کب سے سرگزشت کا قاری ہوں لیکن اتنا یاد ہے جب سے ہوش سنبھالا ہے جب سے سرگزشت پڑھ رہا ہوں کیونکہ اسے میرے والد پڑھ رہے ہیں۔ سرگزشت کے علاوہ میں کوئی بھی کہانیوں، افسانوں کی کتابیں نہیں پڑھتا کیونکہ اس میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ جس طرح ایک بچہ میں پورا درخت چھپا ہوا ہوتا ہے ٹھیک ویسے ہی سرگزشت میں پوری لائبریری چھپی ہوئی ہے۔ اب کہانیوں کی بات کریں۔ کہانیوں میں جو کہانی میرے دل کے سب سے قریب ہے وہ ہے سرب اب، اگر میں ڈاکٹر کیشوریا پڑھ پڑھتا ہوں تو اس پر ایک قلم بناتا۔ ویسے تو اس کہانی کے 10 میں سے 10 نمبر بننے میں لیکن میرا پسندیدہ سلسلہ ہونے کے باوجود میں اسے 10 میں سے 9 نمبروں کا۔ وہ اس لیے کہ شوبی خواہوں لڑکیوں کے پیچھے قتل و غارت کرتا پھرتا ہے۔ جس طرح اس نے شاہین کے قاتلوں کو مارا تھا اور اب ایک ہندو لڑکی کے ساتھ شوہر کو مار ڈالا۔ جبکہ شوبی کے پاس فتح خان کو مارنے کے لیے ایسے کئی مواقع تھے لیکن اس نے فتح خان کو تو کچھ نہیں کہا۔ خیر یہ تو کاشف ریمز صاحب ہی جانشین دوسرا اہم نقطہ آفاقی صاحب کا ہے۔ آفاقی صاحب جس زمانے کی باتیں، یادیں قلم کی نوک سے سنوارتے ہیں اس زمانے کے کردار تو کیا ان کے مداح بھی ایک ایک کر کے آنکھیں بند کر چکے ہیں۔ آپ آج کل کی قلم اندازی کی باتیں کیا کریں۔ پرانی باتیں تو ہمارے سر سے گزر جاتی ہیں۔ جو بات مجھے زیادہ چھتی ہے، میں کیا ہر عبت وطن کو چھتی ہوگی وہ یہ کہ ایک آفاقی صاحب اور دوسرا ریمز راجا ایلو کی تعریفیں کرتے اور پاکستانیوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ان لوگوں کے من نہیں سمجھتے۔ ریمز راجا جب قمری کے معاملے میں ایک فشی ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ایلو والے پاکستانیوں کو دانہ ڈال رہے ہیں۔ پاکستانیوں کو یہ دانہ اٹھالینا چاہئے اور ایشیا کپ کے پاکستان اور ایلو یا بچے کے دوران کشمیری کرتے وقت بھی پاکستانیوں کی خامیاں بتائے جا رہا تھا۔ پتا نہیں ہم پاکستانی خاص کر ہم عام لوگ کب سدھریں گے۔ جس طرح بچہ کھلونے سے کھیلتا ہے جب تموز ابراہوٹا ہے تو کوئی اور کھیل کھیلتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی چاہے عمر کے کسی بھی حصے میں ہو کسی نہ کسی چیز سے کھیلتا ہے لیکن ہمارے سیاست دان، بیوروکریٹ، یا کوئی اور کھلونوں سے نہیں بلکہ ہم سب ملین سے کھیلتے ہیں وقتے وقتے سے ہمارے جذبات، جذبیوں اور ہمارے ایمان کو ٹھیس پہنچاتی جاتی ہے کبھی گستاخانہ قلم تو کبھی فیس بک پر ہم مسلمانوں کو ٹھیس پہنچانے کے لیے مقابلے کیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں امریکی عدالت نے گوگل کو گستاخانہ مواد بنانے کا حکم دیا لیکن گوگل نے اس حکم کے خلاف اپیل کی لیکن گوگل کی اپیل روک دی گئی۔ آپ خود غور کریں اتنے مہینے جو گستاخانہ مواد ان ویب سائٹ پر پوری دنیا کے سامنے رہا اس وقت عدالت کو ہوش نہیں تھا اور ہم ہیں کہ ان گستاخیب سائٹ پر یوٹیوب کو سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں، جانتے ہوئے بھی کہ کتنا سخت گناہ ہے اور کتنی گناہیہ ویب سائٹ ہیں۔ جانتے ہوئے بھی ہم انجان بنے ہوئے ہیں ہم سب اپنے ملک کو سدھارنے کی بات کرتے ہیں۔ ہم خود سدھر جائیں ہمارا دین اور ملک خود باخود سدھ جائے گا۔"

عزیز اللہ فریادیں احمد کو جرنالہ سے دار ہیں "میں سرگزشت اور سسٹمز کی عرصہ دس سال سے خاموش قاری ہوں۔ خصوصاً سرگزشت کے بغیر تو میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ پورا مہینہ دن گن گن کر یکم تاریخ کا انتظار کرتی ہوں۔ سرگزشت ہاتھ میں آتے ہی دو دن میں پورے کا پورا اشارہ چٹ کر جاتی ہوں۔ باقی اٹھائیس دن پھر اس کے انتظار میں گزرتے ہیں۔ آج سے چھ مہینے پہلے سرگزشت پر تبصرہ کرنے کے لیے قلم اٹھانے کی جسارت کی تھی۔ تبصرے کے ساتھ دو بج بیانیوں بھی ارسال کی تھیں۔ اس سے اگلے ماہ کا شمارہ لینے بھاکم بھاکم بک انشال پر پہنچی۔ مگر آکر دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے ڈائجسٹ کھولا دیوانہ وار شہر خیال میں اپنا خط ڈھونڈنے لگی۔ سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ دل دکھ سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس کے بعد کبھی لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حالانکہ کئی بار دل چاہا کہ لکھوں۔ شہر خیال کے کبھی دوستوں کے شاعر اور جاعاد تبصرے پڑھتی اور زیر لب مسکراتی رہتی۔ ڈاکٹر روبینہ انصاری، سدھوہ ہالوٹا گوری اور بشری افضل صاحب آپ سب کو فشی دوست کی جانب سے آداب۔ اپریل کے شہر خیال میں نظر دوڑا رہی تھی کہ نظریں ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ مارے حیرت کے لگ گئی۔ آنکھیں اور منہ دونوں کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہمارے سامنے چھ ماہ پہلے کا لکھا ہوا امارا خط جگہ پر تھا۔ (سبارک ہاؤس محکمہ ڈاک کو ہم نے بھی اسے نیا خط سمجھ کر لگا دیا) چند لمحوں تک بے حس و حرکت ان چند سطروں کو گھورتی رہی۔ سکتے سے باہر لگی تو خوشی سے نہال ہو گئی۔ معراج انکل سے جتنی شکایات یا شکوے تھے۔ سب دور ہو گئے۔ میرے لکھے گئے لفظوں سے اپنا بیت اور عبت کی جو خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ بالآخر مدبر اعلیٰ کے دل پر اثر کر چکی تھی۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس خوشبو نے اثر کرنے کے لیے اتنی مدت کیوں لگائی۔ اس وقت یہ مصرع ذہن میں آ رہا ہے بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ چلیں کوئی بات نہیں دیر آید درست آید۔ معراج انکل پلیز میری دونوں کہانیاں پڑھ کر بتائیں کہ وہ سرگزشت میں شائع ہونے کے قائل ہیں یا نہیں۔ (ابھی آپ مزید مطالعہ کریں۔)"



عقل نشین

ڈاکٹر ساجد امجد
نور محمد کی لائبریری
اور پبلشرز کی کونسل
نے پبلشرز کی کونسل
کی جانب سے
ڈاکٹر ساجد امجد
کی تصدیق کی ہے

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے یعنی ازمہ قدیم سے انسان اس تلاش میں سرگرداں ہے کہ کرہ ارض پر انسان آیا کہاں سے۔ اس کی پیدائش کب ہوئی۔ انسان کی اس فاسق سوچ کے سدباب کی خاطر تمام ادیان نے صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ انسان جنت سے زمین پر آیا۔ زبور، توریت، انجیل اور فرقان الحمید نے کھل کر کہا ہے کہ جنت سے آدم و ہوا کو زمین پر بھیجا گیا ہے۔ دیگر مذاہب میں بھی یہی کہا گیا ہے مثلاً ہندو مذہب نے کہا کہ منو سے منش پیدا ہوا۔ چینی مذہب میں بھی اسی قسم کی باتیں بتائی گئی ہیں مگر اس سائنسدان نے مسلسل غور و فکر کے بعد یہ خیال پیش کیا کہ انسان بندر کی ترقی یافتہ نسل ہے۔ جس طرح ڈریگن و ڈائناسور وقت کی تبدیلی کے بعد مگر مچھ، گرگٹ، چھپکلی میں بدل گئے ہیں اسی طرح بندر کی ایک خاص نسل وقت کی تبدیلی کے بعد انسان کے روپ میں ڈھل گئی ہے۔ اس فاسد خیال کو اس نے بڑے طنطنے سے پیش کیا مگر لوگ اسے جھوٹ کا پلندا کہتے ہیں۔

ایک نامور سائنسدان کا احوال زیست

ان کے نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے لیے نئی راہ کا انتخاب کیا یا یوں کہیے کہ اسے حیاتیاتی ارتقا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انسان ہمیشہ سے ہی ایسا تھا یا اس کی موجودہ شکل و صورت کسی ارتقا کا نتیجہ ہے؟ ان خیالات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تاریخ و ادب سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپی معاشی جدوجہد تک محدود تھی یا امیروں سے تعلقات برعکاس اس کا مشغلہ تھا۔ یہ مشغلہ بھی دراصل معاشی جدوجہد ہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا تاکہ انہیں وہ سخت جدوجہد نہ کرنی پڑے جو وہ کر رہا تھا اور اس کے بعد بھی ٹڈل کلاس سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔

بہی دروازے پر کھڑی تھی۔ اسے جانے کی جلدی بھی تھی لیکن پرکلف پوشاک پہننے میں کچھ دیر تو لگتی ہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کو بھی ہدایات دیتا جا رہا تھا کہ اس کے جانے کے بعد وہ کھیل کود میں نہ لگ جائیں، اپنے اسکول کا سبق یاد کرنے بیٹھ جائیں۔ وہ جب بھی گھر سے باہر جاتا تھا یہ ہدایات دیتا بھی نہیں بھولتا تھا۔ یہ ہدایات تمام بچوں پر اثر انداز ہوتی تھیں لیکن سب سے چھوٹے بیٹے چارلس ڈارون پر ان نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس نے گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے خاص طور پر اس کے کان مروڑے۔ ”نالائق بچے! جب میں واپس آؤں تو تمہارے ہاتھ میں کتاب ہونی چاہیے۔“

اسے چارلس ڈارون کی طرف سے ہمیشہ کی طرح

نظر ڈارون نے ذاتی استعمال کے لیے چھوٹی سی جھکی خرید لی تھی۔ کچھ لم پس انداز کر کے اسکاٹ لینڈ کے امیروں جیسے لباس کے چند جوڑے بھی بخر لیے تھے جسے پہن کر وہ اس بھی پر سوار ہوتا تھا اور یوں سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھا۔ یہ کبھی بھی کبھی ہی نکلتی تھی یعنی اس وقت جب وہ کسی رئیس کے علاج کے لیے گھر سے نکلتا تھا۔ اس طرح وہ بڑی خوبصورتی سے یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ خود بھی اسکاٹ لینڈ کا چھوٹا موٹا نواب ہے۔ اس کی اسی چالاکی سے اس کا مطلب چل رہا تھا۔ اس نے امیر خاندانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ ان کا ذاتی معالج بن کر اتنا کمانے لگا تھا کہ اپنے بہت سے بچوں کے تعلیمی اخراجات اچھی طرح برداشت کر لیتا تھا۔

اس کی وضع قطع بناوٹی تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک خاندانی طبیب تھا۔ اسکاٹ لینڈ کے دوسرے بڑے شہر ایڈنبرگ کے لوگ جہاں وہ مطلب کرتا تھا اس کے خاندان کی اس انفرادیت سے اچھی طرح واقف تھے۔

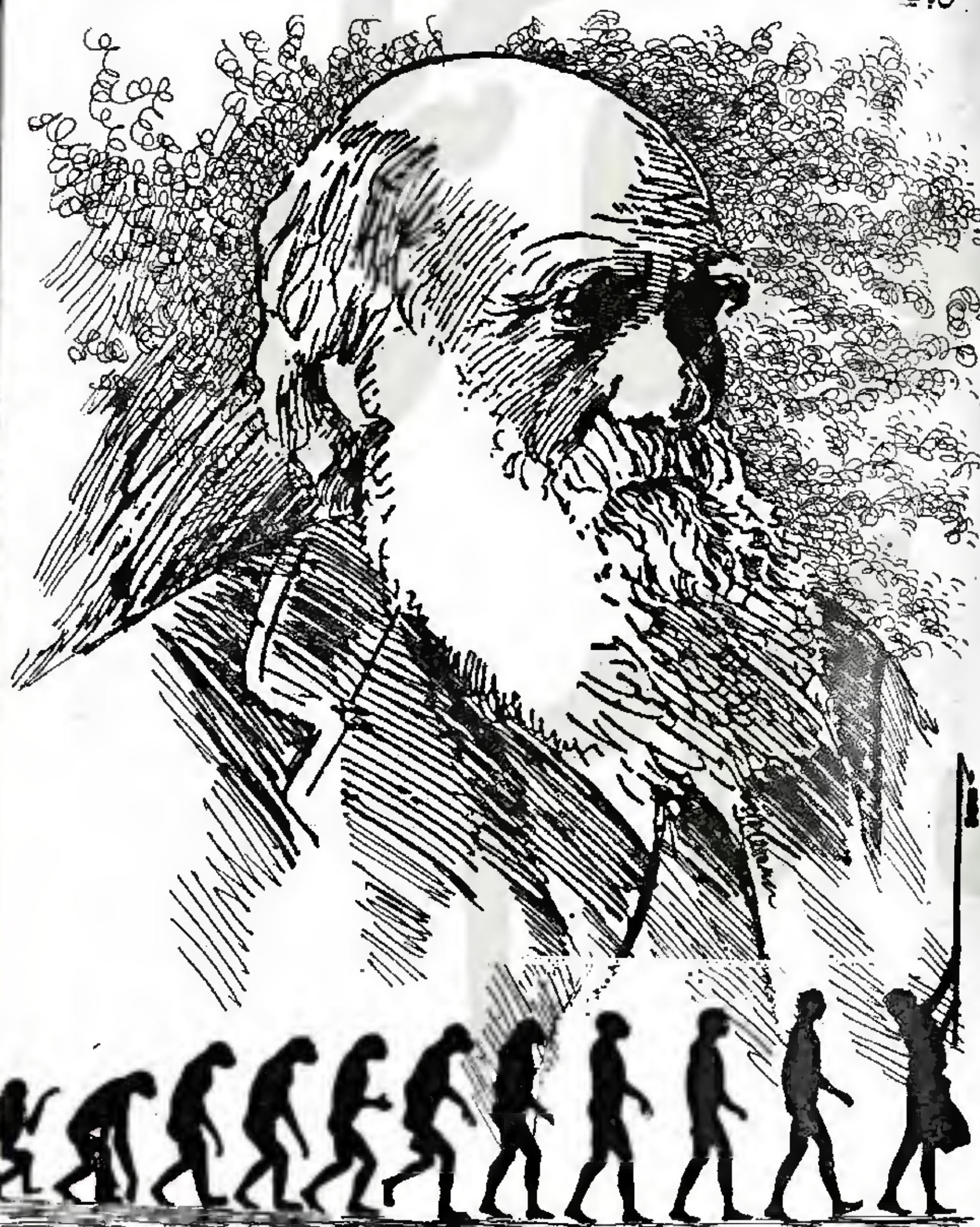
اس کے والد ایریس ڈارون بھی طبیب تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے فکری مجالس میں شریک ہوتے رہے۔ دانشوروں میں انہیں صاحب الرائے سمجھا جاتا تھا۔ ”حیاتیاتی ارتقا“ ان کا خاص موضوع تھا۔ اس موضوع پر انہوں نے ایک کتاب ”زرتو میا“ کے عنوان سے تحریر کی تھی۔

اس کے بیٹے رابرٹ ڈارون نے اپنے والد سے طب تو خوب جی لگا کر سیکھی اور اسے بطور پیشہ اختیار کیا لیکن

دلچسپی نہیں تھی۔ اسکول سے چھٹی بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی بہن کی تھرائن بھی اسی اسکول میں داخل تھی۔ اگر چھٹی کرتا تو فوراً گھر میں خبر ہو جاتی البتہ چھٹی ہوتے ہی وہ آزاد تھا۔ اسکول سے نکلتے ہی یا گھر آنے کے بعد وہ ساحلوں پر نکل جاتا یہاں اس کی تفریح کے بہت سے سامان تھے۔ کٹرے، مکوڑے، سپیاں اور مختلف اقسام کے پتھر اس کی توجہ اپنی

سر دھری کے سوا کچھ نہیں ملا تھا لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا۔ اس نے بڑی بوٹیوں سے تیار کی ہوئی دواؤں کا تھیلا اٹھایا اور کبھی میں بیٹھ گیا۔

چارلس ڈارون 1809ء میں پیدا ہوا تھا اور آٹھ سال کی عمر میں اسکول جانے لگا تھا لیکن اسکول جانے میں محض باب کا خوف شامل تھا ورنہ اسے نصابی کتابوں میں کوئی



طرف کھینچ لیتے۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا کہ فطرت نے جو کچھ بنایا ہے کس طرح سے بنایا گیا ہے۔ سوال یہ نہیں تھا کہ اس نے یہ سوال کر کے کوئی بہت بڑا کام انجام دے لیا تھا۔ یہ سوال پنا نہیں تھا لیکن اس کی کم سنی نے اسے بڑا بنادیا تھا۔ یہ سوال کسی پروفیسر نے اس کے دل میں نہیں ڈالا تھا۔ وہ نیچرل ہسٹری کا طالب علم نہیں تھا کہ کتابوں میں پڑھ لیا ہو۔ یہ سوال تو اس کے ذہن نے تشکیل دیا تھا۔ یہی اس کی اہمیت تھی اور اس سے بڑی بات یہ کہ اس کا جواب بھی وہ خود ہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسکول میں کون تھا جو اس کے سوال کا جواب دیتا۔ یہ پتھر ہمیشہ سے ایسا ہے یا اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں؟ پرندے سب ایک طرح کے ہیں لیکن بعض کے ربعض سے مختلف کیوں ہیں؟ بعض کی چونچ ٹیڑھی اور بعض کی سیدھی کیوں ہے؟ پچھلیوں کی اقسام کیا ظاہر کرتی ہیں؟ انسانوں میں بعض امیر کیوں ہیں، بعض غریب کیوں ہیں؟ ایک ہی چہرہ رکھتے ہوئے ہر انسان دوسرے سے مختلف کیوں ہے؟ یہ سوال ہرگز ایسے نہیں تھے کہ آٹھ سال کے بچے کے ذہن میں ابھرتے مگر اس کے ذہن میں تھے۔ اتنے سوالوں میں گھرا ہوا ڈارون کتابوں کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اسکول کا پروفیسر جب اس سے کوئی سوال کرتا تو دوسرے بچوں کے تہمتوں کے سوا اسے کچھ سنائی نہیں دیتا جو اس پر نہیں رہے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اسے نجی اور کند ذہن سمجھا جانے لگا تھا۔

اس روز بھی یہی ہوا تھا۔ باپ کی بھی جیسے ہی روانہ ہوئی وہ گھر سے نکل گیا۔ اسے آج مختلف گھونسلوں سے چیزوں کے انڈے جمع کرنے تھے۔ وہ جب ایسے کاموں میں مشغول ہوتا تھا تو اسے یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ وہ گھر سے کتنی دور نکل آیا ہے۔ اس وقت بھی اسے یاد نہیں رہا کہ اس کا باپ لوٹ کر گھر بھی آئے گا۔

وہ گھر واپس آیا تو اس کے باپ کا غصہ اس کے سامنے تھا۔ ”کہاں گئے تھے؟“

اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”میں تمہیں کہہ کر گیا تھا کہ اسکول کا سبق یاد کرنے بیٹھ جانا۔“

اس کی مسلسل خاموشی نے رابرٹ کے غصے میں مزید اضافہ کر دیا۔ رابرٹ نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو اس کے دامن میں بھرے ہوئے تمام انڈے زمین پر گر گئے۔ وہ ان انڈوں کو اس لیے اپنے ساتھ لایا تھا کہ ان کے ذریعے پرندوں کی شناخت کرے گا۔ ہر پرندے کے انڈے ایک

سے لگتے ہیں لیکن ان میں معمولی سا ہی صحیح، کیا فرق ہوتا ہے وہ پید کھینچا چاہتا تھا۔ ان انڈوں کا یہ حشر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رابرٹ ڈارون اس کی کیفیت سے بے خبر اسنے سمجھانے پر تلے ہوئے تھے۔

”تمہارے سب بھائی بہن پڑھنے میں دل لگاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے پروفیسر مجھے راستے میں ملے تھے۔ تمہاری شکایت کر رہے تھے کہ تم پڑھنے میں لگتی دیکھی نہیں لیتے۔“

دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہے تھے کہ تم ایک نالائق لڑکے ہو۔“ جانتے ہو مجھے کتنی شرمندگی ہوئی ہوگی؟ وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ تمہارے ہاتھ سے کتابیں لے کر تمہیں کسی کام پر لگا دوں۔ تم نے کچھ سوچا بھی ہے کہ آگے جا کر کیا کرو گے۔ کیوں بے کار کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ اور یہ دیکھو، انڈے گر کر ٹوٹ گئے ہیں۔ تمہاری وجہ سے سارا فرش گندا ہو گیا ہے۔ تم نے کتنی جانیں ضائع کر دی ہیں۔ اس کا گناہ تمہیں ملے گا۔ چلو، اسے صاف کرو اور اپنے کمرے میں جا کر پڑھنے بیٹھ جاؤ۔“

ڈارون نے دھندلی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا اور فرش صاف کرنے بیٹھ گیا۔

اسے حکم ملا تھا کہ وہ کمرے میں جائے اور اپنا سبق یاد کرے۔ وہ کمرے میں گیا ضرور۔ اس نے کتاب بھی ہاتھ میں لے لی۔ اگر کوئی آجائے تو یہی ظاہر ہو کہ وہ پڑھ رہا ہے لیکن اس کا دھیان اب بھی انڈوں کی طرف تھا جو نوٹ گئے تھے۔ اسے ڈر ہو رہا تھا کہ اس کا باپ کہیں وہ اشیا بھی ضائع نہ کر دے جو اس نے اپنے کمرے میں جمع کر کے چھپائی سی لیبارٹری بنائی تھی۔ وہ کتاب کا سبق زور زور سے پڑھنے لگا تا کہ اس کا باپ مطمئن ہو کر اس کے کمرے کا رخ نہ کرے۔

پورے گھر میں یہی ایک کمرہ تھا جہاں اسے سکون ملتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا بھائی بھی آکر اس کے تجربات میں شریک ہو جاتا تھا۔ مسٹر رابرٹ بچوں کے کاموں میں بہت کم دخل دیتے تھے۔ انہیں تو بس اس سے غرض تھی کہ وہ پڑھتے رہیں۔ اس کے بعد وہ جو جی چاہے کریں۔

وہ پابندی سے اسکول جاتا رہا لیکن اس کی آوارگیاں اسی طرح جاری رہیں۔ اسکول سے شکایتیں بھی اسی طرح آتی رہیں۔

ایک دن اس کے باپ نے اس کی حرکتوں کو دیکھ کر اس سے صاف صاف کہہ دیا ”تمہارے رویوں کو دیکھ کر

مجھے لگتا ہے تم خاندان کے لیے بدنامی کے سوا کچھ نہیں نکاؤ گے۔“

رابرٹ اس کی طرف سے فکر مند تھے لیکن خود اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ اس کی عمر ایسی تھی بھی نہیں کہ وہ زندگی کو ایسے رخ سے دیکھتا۔

ایک روز ڈارون کی بہن کیہ تھرائن مسٹر رابرٹ کے سامنے آکر کھڑی ہوئی۔

”میں چارلی (پیار کا نام) کے ساتھ اسکول میں پڑھنے کو تیار نہیں۔ اس کی شرارتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور سب میرا حق اڑاتے ہیں۔“

”تمہیں اس سے کیا ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔“

”وہ سبق یاد نہیں کرتا۔ پروفیسر اسے ڈانٹتے ہیں اور مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ یا تو مجھے کسی اور اسکول میں داخل کروا دیں یا چارلی کو میرے اسکول سے نکال دیں۔ ہم دونوں ایک ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔“

یہ بات ایسی تھی کہ رابرٹ کو اس پر سنجیدگی سے سوچنا تھا۔ کیہ تھرائن کا تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا۔ اسے کسی اور اسکول میں بھیجے گا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ قدم ڈارون کے لیے اٹھایا جاسکتا تھا۔ مسٹر رابرٹ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ممکن ہے اس اسکول میں چارلی کا دل نہ لگ رہا ہو۔ یہاں کے اساتذہ سے وہ مطمئن نہ ہو۔ سوال یہ تھا کہ اسے اب کس اسکول میں داخل کرایا جائے۔ مسٹر رابرٹ کئی دن برابر اس کی نئی درس گاہ کے بارے میں سوچتے رہے۔

اس دوران چارلس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اسے زیادہ صدمہ اس لیے نہیں ہوا کہ ایک تو وہ کم عمر تھا دوسرے یہ کہ اس نے ہوش سنبھالتے ہی ماں کو بیمار دیکھا تھا لہذا اس سے وہ زیادہ قریب نہیں تھا۔ ڈارون کا خیال تھا، اس کا باپ بھی اس کی ماں سے زیادہ خوش نہیں تھا۔ گھر میں زیادہ دن سوگ کی فضا برقرار نہ رہ سکی۔ اس عرصے میں مسٹر رابرٹ یہ بھی طے کر چکے تھے کہ چارلس کو کہاں داخل کرایا جائے۔ گھر سے ایک میل کے فاصلے پر گرگرا اسکول تھا۔ اس اسکول کے پرنسپل ایڈنبرگ کے مشہور عالم اور استاد ڈاکٹر بلر تھے۔ مسٹر رابرٹ کی ان سے اچھی دوستی تھی۔ ایک روز مسٹر رابرٹ ان کے پاس پہنچ گئے۔

”میں اپنے بیٹے کو آپ کے اسکول میں داخل کرانا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا لیکن آپ کے گھر سے میری درس گاہ کا فاصلہ اچھا خاصا ہے اور آپ کا بچہ بہت

چھوٹا ہے۔“

”آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ وہ اب بھی گھر سے اسکول جانے کے لیے اتنا ہی فاصلہ طے کرتا ہے۔“

”کیا مطلب۔“

”مطلب یہ کہ وہ جس اسکول میں اس وقت پڑھ رہا ہے وہ بھی شریوں بری ٹاؤن ہی میں قائم ہے۔ صرف اسکول بدلے گا فاصلہ وہی رہے گا۔“

”آپ اسکول کیوں بدلنا چاہتے ہیں۔ اس بچے کی ایک سوئی میں فرق پڑے گا۔“

”وہاں کے اساتذہ کا خیال ہے کہ وہ پڑھائی میں اچھا نہیں ہے۔ تعلیم سے زیادہ کھیل کود میں لگا رہتا ہے۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں؟“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ عجیب عجیب شوق ہیں اس کے۔ پودے اور چیزوں کے انڈے جمع کرتا رہتا ہے۔“

”اس عمر میں بچوں کو ایسے شوق ہو ہی جاتے ہیں۔“

ڈاکٹر بلر نے کہا۔ ”ایک بات اور بتا دوں۔ اسے اس کے اس شوق سے روکے گا نہیں۔ میرا مطلب ہے زبردستی نہ روکے گا۔ اس کا ذہن کسی اور طرف موڑنے کی ضرورت ہے۔“

”وہ تعلیم کی طرف آتا ہی نہیں تو میں کیا کروں۔ اب تو اس کی ماں بھی اس دنیا میں نہیں رہی جو اس کی نگرانی کر لے گی۔“

”میں آپ کو ایک مشورہ دوں۔“

”اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”ہمارے اسکول میں ہاسٹل بھی ہے۔ آپ اسے ہاسٹل میں داخل کرادیں۔ گھر سے دور رہے گا تو اس میں سنجیدگی آجائے گی۔ میری نگرانی میں بھی رہے گا۔ آپ کے خاندان کا بچہ کند ذہن نہیں ہو سکتا۔ بس ذرا اس کے ذہن کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔“

”آپ ہاسٹل میں اس کی رہائش کا انتظام کرادیجیے۔ میں فیس دینے کو تیار ہوں۔“

چارلس کے لیے کیا فرق پڑتا تھا۔ یہ اسکول نہ سہی وہ اسکول سہی۔ اسے نہ یہاں پڑھنا تھا نہ کہیں اور بلکہ ایک لحاظ سے تو اسے اچھا ہی لگا کہ وہ باپ کی نظروں سے دور رہے گا۔ پھر اسے ان چیزوں کا خیال آیا جو اس نے اپنے کمرے میں جمع کر رکھی تھیں۔ سیپوں کے نمونے تھے۔ کیڑے اور دوسرے کیڑے کوڑے تھے۔ انڈوں کے چھلکے تھے۔ پودوں کی جڑیں تھیں۔ بڑے بڑے شیشے کے مرنجانوں میں پھیلیاں تھیں۔ اسے ان چیزوں کا خیال آیا۔ اگر وہ ہاسٹل

میں رہنے لگا تو ان چیزوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ وہ یہی مرتبہ فکرمند ہوا تھا لیکن زیادہ دیر فکرمند ہونا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد یہاں بھی کام آیا۔ ایک میل کا فاصلہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ میں ہاسٹل سے روز گھر آ جایا کروں گا۔ پچھلیوں کو چار ڈال کر اور کچھ دیر اپنی تجربہ گاہ میں گزارنے کے بعد دوبارہ چلا جایا کروں گا۔ اتنا فاصلہ تو میں بھاگ کر بھی طے کر سکتا ہوں۔

مسٹر رابرٹ نے ایک روز اسے ساتھ لیا اور اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر بٹر کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر بٹر نے اسے ایک شرمیلہ لڑکا پایا۔ ایک ایسا لڑکا جو بہت کم بولتا ہے۔ جو لوگ کم بولتے ہیں وہ عملی لوگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے مسٹر رابرٹ سے کہا تھا۔ ”آپ چارلس کی طرف سے مایوس نہ ہوں۔ یہ بہت جلد کتابوں میں دلچسپی لینے لگے گا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ دس سال کا بچہ ہی تو ہے۔ آپ فکر مت کریں۔ میں اس کا پورا خیال رکھوں گا۔ آپ کو رپورٹ بھی کرتا رہوں گا۔“

مسٹر رابرٹ نے اس کے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان ہاسٹل کے اس کمرے میں پہنچا دیا جو اسے الاٹ ہوا تھا۔ اس کی بہن کیسٹرائن کو اب احساس ہوا کہ اس کا بھائی اس سے دور چلا جائے گا۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہی تھی کیونکہ اسی کی شکایت پر اس کے باپ نے اسے ہاسٹل بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”چارلی، مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہاری شکایت کی اور ڈیڈی نے تمہارا اسکول بدل دیا۔ مجھے معاف کر دو۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ چارلس نے کہا۔ ”جو کچھ ان اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا۔ ان کتابوں سے نہ مجھے اس اسکول میں کوئی سروکار تھا نہ وہاں ہوگا۔ ہاں یہ افسوس ضرور ہوگا کہ جو چیزیں میرے کمرے میں ہیں ان کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کر سکتوں گا۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں ہونے دوں گی۔“

”خبردار، جو تم میرے کمرے میں گھسے۔“

”میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ تمہارے کمرے کی صفائی کرو یا کروں گی۔“

”میں ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہا ہوں۔ میں روز گھر آیا کروں گا۔ اپنی چیزیں خود دیکھ لیا کروں گا۔“

ماہنامہ سرگزشت

”تم ہاسٹل سے روز گھر آیا کر دے۔“

”بشرطیکہ تم ڈیڈی سے شکایت نہیں کرو گی۔“

”اب تو میں تمہاری کوئی شکایت نہیں کروں گی، دیکھ لیتا۔“

”میری اچھی بہن۔ آج رات میں تمہارے ساتھ اور ہوں۔ پھر تو ہاسٹل میں ہی سونا پڑے گا۔ یہ پابندیاں مجھے قطعی پسند نہیں لیکن کیا کروں ڈیڈی کا حکم ہے۔ وہ مجھے نہ جانے کیا بتانا چاہتے ہیں۔“

”وہ چاہتے ہیں تم اسکول میں طب کی تعلیم حاصل کرو اور ڈاکٹر بنو۔“

”انہیں یہ فضول سی فکر نہ جانے کیوں ہے۔ بھی ضروری تو نہیں کہ اگر وہ طبیب ہیں تو میں بھی طبیب بنوں۔“

آئندہ سے میں اس سوال کا جواب بھی تلاش کروں گا کہ کسان کا بیٹا کسان اور طبیب کا بیٹا طبیب ہی کیوں بنتا ہے۔ کم از کم یہ کہ اس کے ماں باپ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔“

وہ رات اس نے بہن بھائیوں کے ساتھ گزاری۔ مسٹر براؤن بڑی دیر تک اسے سمجھاتے رہے کہ نئے اسکول میں اسے کس طرح رہنا ہے۔ کس طرح اپنی پڑھائی پر توجہ دینی ہے اور کس طرح اپنے مستقبل کو تائید بنانا ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ اسے لے کر ڈاکٹر بٹر کے پاس چلے گئے۔ کچھ دیر اسے وہ بھی اسی طرح سمجھاتے رہے جس طرح مسٹر رابرٹ نے سمجھایا تھا۔

”دیکھو بچے! اگر میں بھی تمہاری طرح کھیل کود میں وقت ضائع کر دیتا تو آج اس اسکول کا پرنسپل نہ ہوتا کہیں مزدوری کر رہا ہوتا۔ اب تم خود طے کر لو کہ اس طرح پرنسپل بننا پسند کرو گے یا مزدور۔ یقیناً پرنسپل بننا پسند کرو گے۔ تو پھر آج سے پڑھنے میں دل لگنا شروع کر دو۔ میں تمام اساتذہ سے کہہ دوں گا۔ تمہاری شکایت میرے پاس نہیں آنی چاہیے۔“

چارلس ان نصیحتوں سے تنگ آ گیا تھا۔ اس لیے اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ ان باتوں کا کوئی جواب دے۔

پرنسپل نے ہاسٹل کے وارڈن کو بلایا اور اسے اس کا کمرہ دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔

”تم آج اپنے ہاسٹل کے کمرے میں آرام کرو۔ کل تمہیں تمہاری کلاس دکھادی جائے گی۔ باقاعدگی سے کلاس میں بیٹھنا۔ چھٹی والے دن تم اپنے گھر جا سکو گے۔“

اسے اس کا کمرہ دکھا دیا گیا۔ اس کمرے میں ایک

ماہنامہ سرگزشت

بچہ پڑا ہوا تھا۔ ایک لکھنے کی نیکل تھی اور ایک چھوٹی الماری تھی جس میں وہ اپنی کتابیں اور کپڑے رکھ سکتا تھا۔ ہاسٹل میں ہر طرف خاموشی چھلی ہوئی تھی۔ اسے یہ کمرہ اچھا لگا۔ یہاں کی تنہائی میں وہ اپنے خیالات پر اچھی طرح غور کر سکتا تھا۔

ابتدائی آدمی کے پاس چار پائی کہاں تھی وہ تو زمین پر سوتے تھے۔ بس اس نے چار پائی چھوڑی، زمین پر لیٹ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا اور ادھر ادھر کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ ہاسٹل کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں آیا اور فل بوٹ پہن لیے۔ باہر نکلا اور گیٹ پر پہنچ گیا۔ چونکہ دار نے اسے روکا تو نہیں لیکن یہ ضرورتاً کید کر دی کہ وہ ہاسٹل بند ہونے سے پہلے واپس آ جائے ورنہ دروازہ نہیں کھلے گا۔ اس نے کچھ سنا کچھ نہیں سنا اور باہر نکل آیا۔ وہ آج یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ گھر تک پہنچنے اور واپس آنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ اس نے ایک میل کا فاصلہ کچھ بھاگ کر کچھ چل کر طے کیا اور گھر پہنچ گیا۔ اس کی چھوٹی سی تجربہ گاہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں صس گیا۔ اس کے بہن بھائی اسکول گئے ہوئے تھے۔ صرف ایک بہن گھر پر تھی۔

اس نے کچھ وقت گھر میں گزارا اور پھر ہاسٹل کی طرف چل دیا۔

اسے اندازہ ہو گیا کہ گھر تک آنے اور واپس جانے میں کتنا وقت لگتا ہے۔

صبح سوکر اٹھا اور اپنی کلاس میں پہنچ گیا۔ جہاں روایتی نصاب کا آغاز ہو گیا جس کا مظاہرہ وہ پچھلے اسکول میں دیکھ چکا تھا۔ اسے کلاس میں خالی ذہن بیٹھنے کی عادت ہو گئی تھی، یہاں بھی بیٹھا رہا۔

کلاسیں ختم ہوئیں تو وہ اپنے کمرے میں آیا۔ اپنے فل بوٹ پہنے اور انڈوں، پھولوں اور پتھروں کی تلاش میں نکل گیا۔ فطرت اس کا دامن تھامے ہوئے تھی اور وہ ایک ایک چیز کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

اس نے بہت سی اشیاء جمع کیں اور گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے ان اشیاء کو ایک خاص ترتیب سے رکھا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ ہاسٹل کا دروازہ بند ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔ وہ افراتفری میں گھر سے نکلا اور سڑک پر آتے ہی بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ بہت تیز دوڑتا تھا اور پھر لاٹک بوٹ اس کی مدد کر رہے تھے۔ ہاسٹل تک پہنچا تو گیٹ بند ہونے

ماہنامہ سرگزشت

ہی والا تھا۔ وہ وقت پر پہنچ گیا تھا۔ اس دن کے بعد سے اس کا معمول بن گیا تھا۔ اسکول میں جب اسے کچھ وقت مل جاتا، وہ باہر گھومنے نکل جاتا اور کلاس شروع ہونے سے پہلے بھاگ کر وقت سے پہلے اسکول پہنچ جاتا۔ وہ اکثر ہاسٹل سے غائب رہنے لگا تھا۔ فطری اشیاء جمع کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سلسلہ اس نے جاری رکھا ہوا تھا۔ گھر میں اس کا کمرہ مختلف چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ اس کی لیبارٹری تھی اور اسے دیکھ بھال کے لیے روز گھر جانا پڑتا تھا اور واپسی میں یہ فاصلہ اسے بھاگ کر ہی طے کرنا پڑتا تھا۔

اسکول کے بچے جس عمر میں قاعدہ یاد کرتے ہیں، وہ پودوں کی خصوصیات کا مطالعہ کر کے ان کی درجہ بندی کرنے لگا تھا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باہر حیاتیات پیدا ہو چکا تھا جو کہ فطرت کے تیار کیے ہوئے اسج پر غور و فکر کرنے لگا تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ اسے پس پردہ حقائق معلوم ہو سکیں۔

اس کے پہلے اسکول کا استاد اسے غیر ذستے دار بچہ قرار دے چکا تھا۔ دوسرے اسکول کا حال بھی کچھ اچھا نہیں تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسکولوں میں صرف اتنا ہی معلوم ہو سکتا ہے جتنا کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں جو کچھ تحریر تھا اس کے ساتھیوں کو زبانی یاد تھا۔ اسے ان رٹے ہوئے جوابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کلاس میں بے زار شکل بنائے بیٹھا رہتا تھا۔ بس اتنا پڑھنا ضروری سمجھتا تھا کہ امتحان میں پاس ہو سکے۔

اس کے بعد وہ اپنے خیالوں میں کھوجاتا تھا اور کلاس ختم ہونے کا انتظار کرتا تھا۔ اس کے مطابق یہاں اس کے لیے سیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کلاس ختم ہوتے ہی وہ پودوں، انڈوں، مچھلیوں، کیڑوں، سیپوں اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی تلاش میں نکل جاتا تھا۔ البتہ رات میں اس کے لیے کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ نصاب کی کتابوں میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس نے رات گزارنے کے لیے ایک نئے مشغلے پر عمل شروع کر دیا۔ اسے کہیں سے شکیپیر کے کچھ ڈراسے ہاتھ لگ گئے۔ اس نے انہیں لہک لہک کر پڑھنا شروع کر دیا۔ ہاسٹل کے اکیلے کمرے میں اسے پوری آزادی تھی کہ ڈائلاگ کو بلند آواز میں پڑھ سکے۔ وہ رات گئے تک ان ڈراموں کو ٹہل ٹہل کر پڑھتا رہتا۔ کچھ ہی دن میں اسے یہ خبر ہو گیا کہ وہ شکیپیر کی معیاری انگریزی کو بخوبی سمجھ سکتا ہے جبکہ اس کے ساتھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ رٹے رٹائے سبق پڑھ سکتے تھے اور بس۔

ماہنامہ سرگزشت

ان ڈراموں کے ذریعے اسے مطالعے کا ایسا چمکا ہوا کہ وہ بائرن اور اسکاٹ کی نظمیں لے کر بیٹھ گیا۔ ہاسٹل کی کھڑکی میں بیٹھا رہتا اور یہ نظمیں پڑھتا رہتا۔ اسکول میں غائب دماغ اور سنی مشہور ہو چکا تھا۔ کسی طالب علم نے بھی اس کی طرف دقتی کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ اپنی تنہائی کو کتابوں سے بھلا تا رہا۔

قریب تھا کہ وہ شاعر قسم کی کوئی چیز بن جاتا کہ اچانک ایک کتاب ”دنیا کے عجوبے“ اس کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ اس کتاب کا ایسا دیوانہ ہوا کہ ہر کتاب ہاتھ سے رکھ دی۔ اس کتاب کو پڑھ کر اسے یہ شوق ہوا کہ کچھ علی تجربہ کیے جائیں۔ اس کا ایک بڑا بھائی کیمسٹری پڑھ رہا تھا، ڈارون بھی اس کے تجربات میں شامل ہونے لگا۔ دونوں بھائیوں نے مل کر ایک چھوٹی سی لیبارٹری گھر کے اندر بنائی تھی جہاں وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر گھنٹوں گیسوں کی تیاری میں مگن رہتا تھا۔ ڈارون کے لیے یہ نہایت دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ ہر روز کچھ نہ کچھ نیا تیار کر لیتا تھا اور پھر اپنے کارنامے اسکول کے دوستوں سے بیان کرتا تھا۔ جب ہر وقت اس کی زبان پر ”گیسوں“ کا نام رہنے لگا تو دوستوں نے اس کا نام ہی ”مسٹر گیس“ رکھ دیا۔ وہ پورے اسکول میں اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

جب اس کی یہ حرکتیں عروج پر پہنچ گئیں اور وہ ایک اوسط درجے کے طالب علم سے آگے نہ بڑھ سکا تو ڈاکٹر بلٹر کو اپنا فرض یاد آیا۔ وہ پرسنل تھے۔ ایک ایک طالب علم پر نظر نہیں رکھ سکتے تھے لیکن چارلس ڈارون کے والد مسٹر رابرٹ سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا کہ وہ چارلس کی نگرانی کریں گے۔ انہوں نے ایک روز اسے اپنے آفس میں بلایا۔

”تمہیں معلوم ہے تم اسکول میں کس نام سے پکارے جاتے ہو؟“

”جس نام سے کوئی سائنس داں پکارا جاسکتا ہے۔“

”یہ تمہارا گمان ہے۔ تم ایک نالائق طالب علم کے سوا کچھ نہیں ہو۔ تم فضول حرکتیں کر کے اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہیں اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہیے۔“

وہ اب دس سال کا بچہ نہیں رہ گیا تھا۔ اسے گرامر اسکول میں پڑھتے ہوئے چھ سات سال گزر چکے تھے۔ وہ اب ڈاکٹر بلٹر کی بات کا جواب دے سکتا تھا۔

”ڈاکٹر بلٹر! میں نصاب میں کیا دلچسپی لوں۔ آپ

سات سال ہو گئے تھے کہ پرسنل نے اسے نکال دیا۔ وہ گھر آ گیا۔

”تم جانتے ہو تم نے اپنی زندگی کے سات سال کس طرح برباد کیے ہیں۔“ اس کی بہن نے اس سے کہا۔

”تم یہ جان ہی نہیں سکتیں کہ وہاں گزارے ہوئے یہ سات برس میرے لیے کتنے بیزار کن تھے۔ اسکول اس لیے ہوتے ہیں کہ ذہنی نشوونما کو فروغ ملے لیکن اس اسکول میں تو میری ذہنی نشوونما ہی رک گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ بھی چند چیزیں رٹ کر آ جاتے ہیں اور انہیں کلاس میں آکر اگل دیتے ہیں۔ طالب علم ان کے اگلے ہوئے کو دوبارہ رٹ لیتے ہیں۔ بس اسکول میں رہ کر یہ فائدہ مجھے ضرور ہوا کہ میں نے شیکسپیر، بائرن اور دوسرے شعرا کو ضرور پڑھ لیا۔ یہ بھی بے کار چیزیں تھیں لیکن انہیں پڑھ کر میری انگریزی ضرور اچھی ہو گئی۔“

”اب کیا ارادہ ہے؟ تمہارے لیے جنت سے کون سا اسکول اتر کر آئے گا؟“ اس کی بہن نے پوچھا۔

”میں بھائی کے ساتھ مل کر تجربات کرتا رہوں گا۔ شاید کوئی نئی چیز بتا لوں۔“

وہ پھر اس کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا جو اس کی تجربہ گاہ تھی۔ ان تجربات میں اسے ماڈے کی بدلتی ہوئی حالتیں دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ وہاں ایک گیس دوسری نوعیت میں کے اسکول میں گھسے پٹے مضامین کے سوا پڑھایا ہی کیا جاتا ہے۔ یہ تو ایسا اسکول ہے جو علم اور تعلیم سے بالکل خالی ہے۔“

اس جواب پر ڈاکٹر بلٹر کا چراغ پا ہونا لازمی تھا۔ انہوں نے اس کے والد رابرٹ ڈارون کو بلایا اور ان سے صاف صاف کہہ دیا۔ ”بچے کی ذہنی سطح بلند نہیں۔ اس لیے آپ کتنی ہی کوشش کر لیں یہ تعلیم میں دلچسپی لے ہی نہیں سکتا۔“

”مسٹر بلٹر، آپ دیکھ رہے ہیں میں کتنی کوشش کر رہا ہوں۔ اب یہ پڑھنا ہی نہ چاہے تو میں کیا کروں۔“

”اس میں اس کا قصور بھی نہیں۔ یہ ذہنی طور پر کمزور ہے۔ اسے آپ اسکول سے اٹھالیں۔ یہ ہمارے اسکول کا نام بھی بدنام کرے گا۔“

”کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔ اس سے تو بہتر تھا کہ کوئی کام ہی سیکھ لیتا۔“ رابرٹ ڈارون نے کہا۔

”چارلس ڈارون کو اس اسکول میں پڑھتے ہوئے

بدل جاتی۔ نئی گیس کے اوصاف بھی بدل جاتے۔ جو کچھ نیا بن جاتا پہلی حالت سے مختلف ہوتا۔ دونوں حالتوں میں ایک تعلق اور تبدیلی بھی ہوتی۔ تبدیلی کا عمل طریقہ کار کے بغیر تو نہیں۔ یہ کیسے اور کس طرح ہو رہا ہے یہی تو سوال تھا جو ڈارون فطرت سے پوچھ رہا تھا۔ جب ہوا تبدیل ہو سکتی ہے تو یہ سوال لازمی تھا کہ ہوا پہلے کیسے ہوا کرتی تھی۔ یہی حال دوسری اشیا کا بھی ہے اور انسان کا بھی۔ کیا انسان ہمیشہ سے اسی طرح خوبصورت تھا؟ وہ اس کی کھوج میں لگا ہوا تھا کہ انسان کن مدارج سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ فطرت سے پوچھ رہا تھا کہ بتا تو پہلے کیسے ہوا کرتی تھی۔

وہ اپنی دنیا میں مگن تھا لیکن اس کے والد اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ چارلس کو اچھی تعلیم سے دلچسپی نہیں۔ اسے ایڈنبرگ یونیورسٹی میں داخل کرادیا جائے جہاں وہ طب کی تعلیم حاصل کرے اور خاندانی پیسے کو زندہ رکھے ورنہ اگر وہ ان بے کار کاموں میں مشغول رہا تو مستقبل کا کیا ہوگا۔ وہ کس طرح اپنی روزی پیدا کرے گا۔

اس کی عمر سولہ سترہ سال ہو چکی تھی کہ اسے ایڈنبرگ یونیورسٹی میں میڈیکل کی تعلیم کے لیے داخل کرادیا گیا۔ اسے اس تعلیم سے بھی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ باپ کے سامنے کچھ نہ بول سکا۔ اس کا بڑا بھائی اسی یونیورسٹی میں پہلے سے طب کے شعبے سے وابستہ تھا۔

چارلس ڈارون یونیورسٹی چلا تو گیا لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہاں بھی وہ اپنا وقت ہی ضائع کرے گا۔ ایسے بے مغز لکچر سننے سے تو بہتر ہے کہ کوئی اچھی سی کتاب پڑھ لی جائے۔ اس نے یہی کیا۔ یونیورسٹی کے نصاب کو چھوڑ کر وہ نظریہ ارتقا پر پہلے سے موجود تصورات کا بغور مطالعہ کرنے لگا کیونکہ یہ اس کا موضوع بھی تھا۔ وہ اس نتیجے پر تو پہنچ چکا تھا کہ کائنات تغیر پذیر ہے۔ تبدیلی کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے لیکن اسے دنیا کو سمجھانے کے لیے ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔ اس نے ان تصورات کا مطالعہ کیا تو اس پر یہ واضح ہوا کہ اس مسئلے پر دو گروہ قابل ذکر ہیں۔ ایک گروہ مذہبی تھا۔ اس گروہ کا خیال تھا کہ کائنات کا نظام عمل اور متعین ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہو سکتی۔ خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس کے بارے میں اصول و ضوابط متعین ہیں۔ لوگ دیوتا کو ناراض کرتے ہیں تو سزا پاتے ہیں۔ اسے تاریخ کے مطالعے نے بتایا کہ کلیلیو نے

ایک سچائی سے پردہ اٹھایا تھا۔ اس نے آگاہ کیا کہ زمین ایک سیارہ ہے جو سورج کے گرد گھومتا ہے۔ اس انکشاف پر اسے پادریوں کی طرف سے سزائے موت سنائی گئی حالانکہ بعد میں ثابت ہوا کہ وہی سچا تھا۔

پیدائش و ارتقا کا بھی یہی حال تھا۔ دانشور یہ کہتے ضرور تھے کہ کائنات تغیر پذیر ہے لیکن اسے ثابت کرنے کے لیے تحقیق کی ضرورت تھی جو سائنس کا کام ہے۔ ڈارون ناوانسنگی میں اس طرف کا مزمن تھا۔ ناوانسنگی میں اس لیے کہ ابھی وہ بالکل ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ اس نے سائنس کی کوئی تعلیم یا قاعدگی سے حاصل نہیں کی تھی۔ صرف یہ کہہ دینے سے کام نہیں چل سکتا تھا کہ کائنات تغیر پذیر ہے۔ یہ کن مراحل سے گزری اور کب سے گزرتا شروع ہوئی، یہ تحقیق طلب تھا۔ باشعور انسان کب سے اس کردہ ارض پر موجود ہے، اس مدت کا تعین آسان نہیں تھا۔ کیا انسان ہمیشہ سے اتنا ہی خوبصورت تھا؟ یہ سوال چارلس کو اس عمر میں پریشان کر رہا تھا۔

اس کی اس پریشانی کو اس کی نالائقی سمجھا جا رہا تھا۔ اس کے باپ نے یہ سوچ کر اسے اپنے ساتھ مطب پر بیٹھنے کو کہا کہ اس طرح اسے طب کی عملی تعلیم کا موقع بھی ملے گا اور وہ ادھر ادھر گھومنے سے بچ جائے گا۔

چارلس کے ذہن نے یہ کام لگایا گیا کہ جو غریب مریض آتے ہیں اور فیس کم دیتے ہیں وہ ان کا علاج کرے۔ اس طرح اس کو اچھی طرح پریکٹس ہو جائے گی۔ مشورے کے لیے مسٹر رابرٹ موجود تھے۔ چارلس کو یہ کام اس لیے اچھا لگا کہ اس کے مریض غریب تھے اور غریبوں سے اسے ہمدردی تھی۔ وہ دلجمعی سے ان کا علاج کرنے لگا۔ انہیں دل لگا کر چیک کرنا اور بہتر سے بہتر و واجویز کرنا۔ اس کی اس دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مسٹر رابرٹ نے پہلی مرتبہ اسے شاباش دی۔

”بیٹا، اچھا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جو مریضوں کا اعتماد حاصل کر لے۔ تم نے یہ اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ مجھے امید ہے تم اچھے ڈاکٹر بنو گے۔“

مسٹر رابرٹ نے اسے اسی امید کے ساتھ مطب پر بٹھایا تھا اور وہ اس کی کارکردگی سے خوش تھے۔ مسٹر رابرٹ کا خیال تھا کہ وہ طب میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن دراصل وہ غریبوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔

وہ مطب پر بیٹھا تو اسے اپنے باپ کی صحیح آمدنی کا علم ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ اچھے خاصے پیسے کما رہا

ہے اور مرنے سے پہلے اچھی خاصی جائداد بنا لے گا۔ جو کچھ وہ چھوڑ کر مرے گا اور جو کچھ میرے حصے میں آئے گا وہ یقیناً اتنا ہوگا کہ میں آرام سے زندگی گزار لوں اس لیے مجھے مزید کمانے کے لیے طب سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے تو بہتر ہے مجھے دنیا اور فطرت کو سمجھنے کے لیے وقت نکالنا چاہیے۔

وہ ایڈنبرگ یونیورسٹی میں طب کی تعلیم حاصل ضرور کر رہا تھا لیکن اس کی دلچسپی نہیں اور تھی۔ اسے کیمسٹری اچھی لگتی تھی کیمسٹری کے پروفیسر مسٹر ہوپ تھے۔ ان سے اس کی خوب بات تھی۔ ان کی کلاسوں میں بھی خوشی سے جاتا تھا۔ طب کی تعلیم کے دوران اسے آپریشن کے عملی تجربہ کے لیے آپریشن تھیمز میں لے جایا گیا۔ یہاں ایک بچے کا آپریشن ہو رہا تھا۔ ان دنوں کلوروفارم کے ذریعے مریضوں کو بے ہوش کرنے کا رواج نہیں تھا لہذا مریض کے لیے آپریشن نہایت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ ڈارون اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اس آپریشن کو دیکھ رہا تھا۔ بچہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ ڈارون سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا۔ وہ آپریشن تھیمز سے بھاگ آیا اور پھر کبھی وہاں نہیں گیا اور یہ طے بھی کر لیا کہ وہ اس پیشے کو کبھی اختیار نہیں کرے گا۔

بڑی مشکل سے اس نے ایک سال گزارا۔ اور دوسرے سال وہ نیچرل سائنس میں چلا گیا۔ وہ ان نوجوانوں کے گروپ میں شامل ہو گیا جو نیچرل سائنس کے مطالعے اور تحقیق میں مگن ہو چکے تھے۔

اس کی معلومات، قابلیت اور دلچسپی نے اساتذہ کو اس کا پرستار بنا دیا۔ انہیں تعجب ہوتا تھا کہ جس لڑکے نے ابھی نیچرل سائنس کے مضامین پڑھنے شروع کیے ہیں، وہ اتنی معلومات کیسے رکھ سکتا ہے۔ جو کچھ اسے کلاس میں پڑھایا جاتا ہے وہ اس سے آگے چل رہا تھا۔ ایک دن پروفیسر گرانٹ نے اسے اپنے پاس بلایا۔

”چارلس، تم فطری اشیاء کے بارے میں اتنا کیسے جانتے ہو جبکہ یہ مضمون تم نے پہلی مرتبہ اختیار کیا ہے۔“

”نیچرل سائنس میرا مشغلہ ہے جس پر میں بچپن سے غور کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی پڑھی ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے کتابوں سے وہ سب کچھ نہیں آ سکتا جو تم سیکھ چکے ہو۔“

”پروفیسر صاحب، دیوانگی سب کچھ سکھا دیتی ہے۔“

میں نے اپنے کمرے میں تجربہ گاہ بنائی تھی جس میں مری ہوئی مچھلیاں بھی تھیں، زندہ مچھلیاں بھی۔ زندوں کے انڈے بھی تھے اور مختلف اقسام کے بھول بھی۔ گیکڑے اور نیپیاں بھی تھیں۔ میں بہ آسانی بتا سکتا ہوں کہ فلاں انڈا کس پرندے کا ہے۔ اب تو میں یہ بھی جان گیا ہوں کہ فلاں پرندہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ مجھے گمان ہے کہ انسان بھی کبھی گھوڑے اور بندر سے مشابہت رکھتا ہوگا لیکن کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تحقیق سے ثابت کرنا ہوگا ورنہ گھوڑے اور بندر کو اپنے آباؤ اجداد کو تسلیم کرے گا۔“

”چارلس، تم بہت خطرناک راستے پر جا رہے ہو۔ اگر تم اس میں کامیاب بھی ہو گئے تو پادری تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔“

”جیت بالآخر جی جانی کی ہوتی ہے۔“ چارلس ڈارون نے کہا۔ ”کیا آپ نے نہیں سنا کہ گیلیلو کو سزائے موت دے دی گئی تھی محض اس جرم میں کہ اس نے کہا تھا، زمین ایک سیارہ ہے اور وہ سورج کے گرد گھومتی ہے۔ بعد میں یہ نظریہ سچا ثابت ہوا اور سب نے مان لیا۔“

”میں تو اس خطرے کی بات کر رہا تھا جو تمہیں درپیش ہے۔“

اس ملاقات کے بعد پروفیسر گرانٹ سے اس کی قربت بڑھتی چلی گئی۔ یہ ملاقاتیں دوستی میں بدل گئیں۔ مسٹر گرانٹ اکثر مشکل مسئلوں میں اس سے مشورہ کرنے لگے۔ اس نے مسٹر گرانٹ کو کبھی مایوس نہیں کیا۔

پروفیسر گرانٹ حیاتیات کے نہایت قابل استاد تھے اور اس موضوع پر معیاری تحقیقات شائع کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ وہ جاندار اکٹھے کرنے کے لیے ساحل سمندر پر جاتے رہتے تھے۔ چارلس کی شکل میں انہیں ایک اچھا مددگار مل گیا۔ وہ بھی ان کے ساتھ جانے لگا۔ ان کا سامان اٹھائے ساتھ ساتھ پھرتا۔ وہ دونوں سمندری حیاتیات بھی اکٹھے کرتے جاتے اور ان کے درمیان ارتقا کے موضوع پر گفتگو بھی جاری رہتی۔ یہ گفتگو کبھی کبھی تکرار کی صورت اختیار کر لیتی۔ دونوں سامان رکھ کر ایک طرف بیٹھ جاتے اور بحث کرنے لگتے۔ پروفیسر گرانٹ ارتقا پسند مفکر لا مارک کے نظریات سے متفق تھے جبکہ ڈارون کو لا مارک کے نقطہ نظر سے اختلاف تھا۔ یہی اتفاق و اختلاف دونوں کے درمیان بحث کا موضوع بن جاتا تھا۔ لا مارک کہتا تھا کہ تمام جاندار انواع نامیاتی و حیاتیاتی نظام کے ذریعے سے ایک دوسرے

سے منسلک ہیں۔ اس نے حیاتیاتی نظام کو مربوط قرار دیا تھا جبکہ ڈارون کہتا تھا کسی ایک نوع میں تمام جاندار ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پودوں اور جانوروں کی کسی ایک نسل میں شامل تمام ارکان ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف رنگ، قد، وزن، آواز، چلنے کی رفتار اور چہرے کے خط و خال کی مخصوص نوعیت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر کوئی گڈریا اپنے ریوڑ کی تمام بھیڑوں کو پہچانتا ہے۔ کسی ایک خاندان میں بہن بھائی ایک جیسے نہیں ہوتے حالانکہ والدین نہیں بدلتے۔ یہ تغیرات ہیں جو ہر نسل میں وجود رکھتے ہیں جو نسل تولید کے ذریعے نئی نسلوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

یہ سلسلہ دلچسپ بھی تھا اور معلومات افزا بھی لیکن زیادہ دن قائم نہ رہ سکا۔ پروفیسر گرانٹ لندن یونیورسٹی چلے گئے۔ ان کے چلے جانے سے چارلس ڈارون اکیلا ضرور رہ گیا لیکن اس نے ساحل پر جانا نہیں چھوڑا بلکہ اس نے وہ راہ اختیار کی جو وہ پروفیسر گرانٹ کی موجودگی میں اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ملاحوں سے دوستی گانٹھ لی۔ جب وہ مچھلیاں پکڑنے کے لیے جانے لگتے تو وہ بھی ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاتا۔ واپسی پر اسے بہت سی سمندری مخلوق مل جاتی جس کی اسے ضرورت تھی۔

ان مخلوقات کے بغور مطالعے کے بعد وہ بعض نتائج تک پہنچ گیا اور اپنی یادداشتیں جمع کرنے لگا۔

ایڈنبرگ یونیورسٹی میں، پروفیسر جیمسن نے حیاتیات کے طلبہ کے لیے ”پلانی سوسائٹی“ قائم کی تھی۔ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم تھا جس پر طلبہ حیاتیات کے موضوع پر سائنسی اور تحقیقاتی مقالات پیش کرتے تھے اور ان پر بحث کرتے تھے۔ ڈارون نے بھی اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا جس پر بحث کرنے والوں نے ملے جلے خیالات کا اظہار کیا۔ بعض نے اختلاف کیا بعض نے اتفاق لیکن اس کی محنت پر سب نے اتفاق کیا۔ ہر زبان کہہ رہی تھی کہ کسی محقق کو اتنی ہی محنت کرنی چاہیے۔

اس وقت اس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ اسی سال اس نے اپنا دوسرا تحقیقی مقالہ ”پلانی سوسائٹی“ کے پلیٹ فارم پر پیش کیا۔

اس کے علاوہ وہ رائل میڈیکل سوسائٹی کا بھی رکن بن گیا لیکن جلد ہی اکتا بھی گیا۔ اس کے خیال میں یہاں کے اکثر لوگ روایتی تھے۔ پھر وہ ورنیرین سوسائٹی کا ممبر بن

گیا۔ یہاں کا ماحول اسے خوشگوار معلوم ہوا کیونکہ سوسائٹی کے اجلاسوں میں نیچرل ہسٹری پر مقالے پڑھے جاتے تھے اور صحت مند بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

اب اس کی قابلیت کو تسلیم کیا جانے لگا تھا اور اسے طالب علم محققوں میں اہم مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اسی قابلیت کے اعتراف کے طور پر اسے ایڈنبرگ کی رائل سوسائٹی کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ اس سوسائٹی میں یورپ کے نامور دانشور اور سائنس دان شامل ہونے کی تمنا کرتے تھے اور اسے کسی سفارش کے بغیر اس کی رکنیت کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسے دانشور تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس کے ”نظریہ ارتقا“ کے کاموں کو سراہا گیا تھا۔

اس عرصے میں وہ طب کو پوری طرح نظر انداز کر چکا تھا۔ اب وہ پوری طرح تحقیق و مطالعہ میں مصروف تھا۔ حیاتیات کے موضوع پر اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔

ایڈنبرگ میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا اور توقع کی جا رہی تھی کہ ایک دن وہ اپنے نظریات سے دنیا کو چھوڑ دے گا۔ لیکن اس کے والد مسٹر رابرٹ اس کی ان کامیابیوں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اب بھی اس کی طرف سے ناامید تھے۔ وہ مسلسل کوشش کر رہے تھے کہ ڈارون راہ راست پر آ جائے۔ اس کے والد کی نظر میں وہ راستے سے ہٹ گیا تھا۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے ٹوکنے لگے تھے۔ ڈارون کا یہ حال کہ وہ فطرت اور فطری قوانین کی تلاش میں سرگرداں تھا اور اس کا باپ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ اس کے مستقبل کا کیا ہوگا۔

اس کے والد اس کی طرف سے اتنے مایوس ہو چکے تھے کہ وہ اس کا نام ہی بھول چکے تھے۔ وہ اسے ”نکما“ کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ ان کی نظر میں ”طب“ ایک اچھا پیشہ تھا۔ انہوں نے چاہا بھی یہی تھا کہ وہ ایک اچھا طبیب بن جائے لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ طب میں ناکام ہو چکا ہے۔ پھر اسے کیا بنایا جائے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہے اور ایک دولت مند شخص بن جائے۔ پھر انہوں نے یہی سوچا کہ ڈارون کو پادری بنادیا جائے۔ پادری سیرکاری ملازم ہوتے تھے۔ ان کو بھی ترقیاں اور مراعات ملتی تھیں۔ انہوں نے اپنے کسی بچے کو مذہبی تعلیم کی طرف راغب نہیں کیا تھا۔ یہ شعبہ صرف ڈارون کے لیے منتخب کیا کیونکہ ان کی نظر میں وہ نااہل اور نکما تھا۔

”تم اسکول میں بھی نالائق تھے۔ طب کی تعلیم بھی تم

حاصل نہ کر سکے۔ اب ایک باعزت شعبہ بھی رہ جاتا ہے کہ تم پادری بن جاؤ۔ سرکاری ملازم بن جاؤ گے۔ آئندہ زندگی میں ترقی بھی پاتے رہو گے۔ میں سربھی گیا تو میری روح کو سکون ملے گا کہ تم کسی قابل بن گئے۔“

”میں جو کچھ بنا چاہتا ہوں مجھے بننے دیجیے۔“
”میں تمہیں مجھیرا بنانا نہیں چاہتا کہ ملازم بن کر کشتی میں جاؤ اور مچھلیاں پکڑ کر لے آؤ۔ گھونسلوں میں جھانکنے کے دن بنے۔ اب تم کچھ کر کے دکھاؤ تاکہ ڈارون خاندان کا نام روشن ہو۔“

”اسی نام کو روشن کرنے کے لیے تو اتنی تک دو دو کر رہا ہوں۔“

”کیا حاصل۔“
”مجھے رائل سوسائٹی کا ممبر بنالیا گیا۔ یہ ایسا اعزاز ہے کہ بڑے بڑے دانشور اور سائنس دان اس کی آرزو کرتے ہیں۔“

”یہ بس اعزاز ہی اعزاز ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے تمہیں کوئی کام کاج بھی کرنا پڑے گا۔“

”میری خواہشات اتنی نہیں ہیں کہ مجھے زیادہ مشقت کی ضرورت ہو۔“

”تمہاری نہ ہو میری خواہش ضرور ہے کہ تم باعزت کہلاؤ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم پادری بن جاؤ۔ میں نے بات کر لی ہے۔ تمہیں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیمبرج جانا ہوگا۔ میں نے کہہ دیا ہے تو بس جانا ہوگا۔“

چارلس ڈارون نے معمولی سی مزاحمت کی اور پھر باپ کی بات مان لی۔ فرماں برداری اس کی فطرت میں تھی۔ وہ بھی باپ کی بات نہیں ٹالتا تھا۔ اب بھی اس نے باپ کی ہدایت پر عمل کیا۔ مذہب کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ جو کچھ اس نے اسکول میں پڑھا تھا سب بھول گیا تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ کیمبرج میں جانے سے پہلے مذہب پر کلاسیکل کتب کا مطالعہ کر لے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے پادری نہیں بننا ہے لیکن دلچسپ بات ہے کہ پادری بننے کے لیے کیمبرج چلا گیا حالانکہ اسے بعد میں کہنا پڑا۔ ”میری زندگی کے تین برس ضائع ہو گئے جو میں نے کیمبرج میں مذہبی تعلیم کے حصول پر لگا دیے۔ ایک اسی پر منحصر نہیں۔ وہاں بہت سے ایسے تھے جنہیں مذہب یا مذہب کی تعلیم سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یہ تعلیم صرف ملازمت کے حصول کے لیے حاصل کر رہے تھے۔“

اس نے بہت جلد مستقبل کے ایسے پادریوں کو ڈھونڈ لگالا جو مذہب سے برائے نام دلچسپی رکھتے تھے۔ کلاس میں وہ مذہبی بنے رہتے تھے لیکن کلاس کے بعد جی بھر کے شراب پی جاتے تھے اور تاش کھیلتے تھے۔ وہ ایک دن اس محفل کے ایک رکن سے ملنے کے لیے پہنچ گیا۔

”ہیلو! میرا نام چارلس ڈارون ہے۔“
”ہمیں تمہارے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔“

”کیا معلوم ہو چکا ہے۔“
”یہی کہ تم نیچرل سائنس کے طالب علم تھے اور یہاں زبردستی پیچھے گئے ہو۔“

”تو کیا تم اپنی مرضی سے یہاں آئے ہو۔“
”اب ایسا بھی نہیں ہے کہ زبردستی بھیجا گیا ہوں۔

”ہمیں کوئی باعزت پیشہ تو اختیار کرنا ہی تھا۔“
”تم کہہ سکتے ہو کہ تم دل سے مذہبی ہو۔“

”ہماری عمریں ایسی نہیں کہ ہم خشک زندگی گزاریں۔ جب تک ہم ڈگری لے کر کسی چرچ میں نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک تو آزاد ہیں۔“

”یہی میرا بھی خیال ہے۔“ ڈارون نے کہا۔
”مجھے خوشی ہوئی کہ میرے گروپ میں ایک اور کا

اضافہ ہوا۔“
چارلس اس گروپ میں شامل ہو گیا۔ اپنی ذہانت اور دلچسپ باتوں سے اس گروپ میں اپنے لیے ایک خاص جگہ بھی بنالی۔ یونیورسٹی کے ایک الگ تھلک حصے میں جی بھر کے شراب پی جاتی۔ تاش کی بازیاں لگتیں اور میوزک سنا جاتا۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے یہاں بھی اپنی دلچسپی کی ہیروئی شروعات کر دی۔ فرصت کے اوقات میں وہ فطرت کے مطالعے کے لیے دور تک نکل جاتا۔ اس کی اسی دلچسپیوں نے اس کی ملاقات پروفیسر ہنسلو سے کرا دی۔ ان سے ملاقات کے بعد اس نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ اس کا اچھا وقت گزر سکتا ہے۔ اسے اس یونیورسٹی میں ”نیچرل تھیالوجی“ پڑھنے کے لیے بھیجا گیا تھا جبکہ اس کی دلچسپی نیچرل ہسٹری تک محدود تھی۔ اس نے اپنے لیے راستہ نکال لیا۔ اس نے پروفیسر ہنسلو کی کلاسوں میں جانا شروع کر دیا۔ پروفیسر ہنسلو پودوں کے بارے میں عملی تجربے کے لیے فیلڈ میں لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈارون نے سنا کہ

وہ اپنے شاگردوں کو کہیں باہر لے جا رہے ہیں تو وہ بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔ دریا کے کنارے کنارے چلتے ہوئے پروفیسر ہنسلو جس طرح نایاب پودوں اور جانوروں کے بارے میں معلومات فراہم کر رہے تھے اور طلبہ کے سوالوں کے جوابات خوش دلی سے دے رہے تھے، ڈارون کے لیے یہ منظر نہایت دل خوش کن تھا۔ ڈارون نے جب اس گفتگو میں قتل دیا تو پروفیسر موصوف پر بھی اس کے جوہر کھلے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ڈارون اس قدر معلومات اپنے ذہن میں لیے پھر رہا ہے۔

جب ایسے کئی دورے ہو چکے اور پروفیسر ہنسلو کو یقین ہو گیا کہ ڈارون محض ایک شاگرد نہیں بلکہ اپنی قابلیت کے اعتبار سے نامور سائنس دانوں میں بیٹھنے کے لائق ہے تو انہوں نے دوستی کا دائرہ بڑھا دیا۔

”کیا تم اتنا وقت نکال سکتے ہو کہ ہفتے میں ایک دن میرے گھر آ سکو۔“

”یہ تو میرے لیے عظیم عزت افزائی ہوگی۔“
”چھٹی کے دن میرے پرانے شاگرد اور سائنس

میں دلچسپی رکھنے والے احباب جمع ہوتے ہیں۔ اس محفل میں ادبی شخصیات بھی ہوتی ہیں۔ گپ شپ ہوتی ہے، فکر و فلسفہ پر بحثیں ہوتی ہیں۔ ہمیں ان محفلوں میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔“

وہ ان کی دعوت پر ایسی ہی ایک یادگار شام کو پروفیسر صاحب کے گھر چلا گیا۔ اس نے اس سے پہلے اتنے اہل علم ایک جگہ جمع ہوتے ہوئے نہیں دیکھے تھے۔ ڈارون نے محفل میں شریک ہوتے ہی بحث کا رخ ارتقا کے موضوع کی طرف موڑ دیا تاکہ وہ اپنی معلومات سے اہل محفل کا رخ اپنی طرف موڑ سکے اور اس کا تعارف اچھی طرح ہو سکے۔

محفل کا اختتام ہوا تو ہر زبان پر اسی کی باتیں تھیں۔ تمام لوگ خوش تھے کہ پروفیسر ہنسلو نے ایک اچھے ساتھی کا اضافہ کیا ہے۔ اس بات کا افسوس بھی تھا اور سب نے اس کا اظہار بھی کیا کہ وہ پادری بننے کے لیے مذہب کی تعلیم حاصل کر رہا ہے جبکہ وہ فلسفہ اور سائنس کی دنیا میں بہت سے کارنامے انجام دینے کا اہل ہے۔

ان محفلوں نے اس کے احباب میں اضافہ کر دیا۔ اب وہ اکثر اپنی کلاسوں سے غائب رہنے لگا۔ اس کا وقت فلسفیوں اور دانشوروں کے ساتھ گزرنے لگا۔ ان صحبتوں نے اسے اپنے نصاب اور اپنی کلاسوں سے بالکل ہی برکشتہ

کر دیا۔ اس سے پہلے وہ خاموشی سے نیچر سن لیا کرتا تھا لیکن اب وہ دوستوں کی محفلوں میں ان نیچروں کا مذاق بھی اڑانے لگا۔ مذہبی سوچ اور اس کی فکر میں زبردست کھراؤ تھا جو اب کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ پادری کہتا تھا قدرت نے جو چیز جس طرح بنائی ہے آج تک اسی طرح ہے۔ اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ جبکہ ڈارون یہ کہتا تھا کہ ہر چیز ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔ ارتقائی سفر ابھی رکا نہیں۔ یہ بہت بڑا فاصلہ تھا جو کسی طرح طے نہیں ہو سکتا تھا۔

ہفتے میں دو دن اسے اپنی کلاس کے دوسرے طلبہ کے ساتھ چرچ میں جانا پڑتا تھا۔ یہاں موسیقی کی دھن پر ایک نغمہ گایا جاتا تھا جس کے بول تھے ”گاڈ سیو دی کنگ“ (God save the king) ڈارون موج میں آ کر کہا کرتا تھا، خدا بادشاہ کی حمایت نہیں کرے گا کیونکہ لوگوں کو بادشاہ کی سلامتی عزیز نہیں۔ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ تاجروں اور صنعت کاروں کا سرمایہ دار طبقہ بادشاہ کے خلاف ہو گیا۔ کسانوں کے دلوں میں جاگیرداروں، سرکاری افسروں اور مذہبی غالموں کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی۔ ایسے سماجی ماحول میں خدا نے بادشاہ کی سلامتی پر توجہ نہیں دی۔

ڈارون کی بے رغبتی بڑھتی جا رہی تھی۔ پروفیسر ہنسلو سے اس کی دوستی گہری ہو گئی تھی۔ وہ اب اپنا زیادہ وقت پروفیسر ہنسلو کے ساتھ گزارتا تھا۔ اب وہ ان کے فیملی ڈنر میں بھی شریک ہونے لگا تھا۔ گویا اب وہ ان کا فیملی ممبر بن گیا تھا۔ وہاں آنے والے نابھہ روزگار شخصیات سے اس کے تعلقات گہرے ہو گئے تھے۔ انہی میں ایک صاحب سیرجے، ہرشل تھے۔ ان کی ایک کتاب نے بہت شہرت پائی تھی۔ یہ کتاب نیچرل فلاسفی کی تاریخ کا ایک مطالعہ تھا۔ ڈارون کی ملاقات جب سے پروفیسر ہنسلو سے ہوئی تھی وہ اس کتاب کے بارے میں سن رہا تھا۔ گھنگو کے دوران اس کتاب کے حوالے اور اقتباسات سن رہا تھا۔ اب جو مصنف سے ملاقات ہوئی تو اس کتاب کے پڑھنے کا جذبہ جاگا۔ مصنف سے تعلقات بھی ہو گئے تھے۔ مطالعہ کے دوران اگر کوئی مشکل ہوتی تو ان سے پوچھا جاسکتا تھا۔ اس نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا تھا اسے معلوم ہوتا تھا وہ کسی دریا سے سمندر میں آ گیا ہے۔ اسے اپنا علم بہت چھوٹا نظر آنے لگا لیکن قابل ذکر بات یہ تھی

منشی محمد دین فوق

1877ء-1945ء

کوٹلی ہزاراں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد سیالکوٹ میں پٹوار کا کام سیکھنے گئے۔ کچھ عرصہ جموں میں ملازمت کی پھر لاہور چلے آئے۔ ابتدا میں کئی اخبارات کے ایڈیٹر رہے۔ آخر میں اپنا اخبار ”کشمیری“ جاری کیا۔ ابتدائی تعلیم کے دوران ہی شعر گوئی کی ابتدا ہوئی۔ آپ نے بہت سی تاریخی کتابیں لکھیں۔ جن میں کشمیر کی مشاہیر خواتین، یاد رفتگان، کلام فوق، نغمہ و گزوار، تاریخ کشمیر، اقوام کشمیر اور تاریخ بڈشاہی بہت مشہور ہیں۔

فوق لدھیانوی

14 نومبر 1914ء-30 دسمبر 1999ء

اردو کے ممتاز غزل گو شاعر۔ اصل نام خواجہ سکندر رفیق علی تھا۔ لدھیانہ میں پیدا ہونے کی نسبت سے فوق لدھیانوی کہلائے۔ ان کے شعری مجموعوں میں دُخم جاں اور متاع جاں شامل ہیں۔ ماہنامہ ہمسفر کے مدیر اعلیٰ بھی تھے۔ راولپنڈی میں انتقال کیا۔ یہیں ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

مرسلہ: نذر حسین، راولپنڈی

”ہاں، یہ تو میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ اس نے پادری بننے کے لیے ڈگری لے لی ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ میری طرح ماہر طب ہوتا۔ خیر اس کا پادری ہونا بھی اس کے روشن مستقبل کے لیے اچھا ہی ہوگا۔“

”دراصل کوئی بھی طالب علم اس فیلڈ میں جائے تو اچھا ہوتا ہے جس میں اسے دلچسپی ہو۔“

”مجھے تعجب ہے کہ اسے پادری بننے میں دلچسپی تھی۔“

”میں اس سے کبھی بڑی خوش خبری آپ کو سنانے آیا ہوں۔“

”کیا یہ حیثیت پادری اس کا تقرر ہو گیا ہے؟“

”اس سے بھی بڑی خوش خبری ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک برطانوی جہاز تحقیقاتی دورے پر روانہ ہو رہا ہے۔“

”ہاں سنا تو ہے لیکن اس کا ڈارون سے کیا تعلق۔“

”اس کا تعلق یہ ہے کہ ماہر طبوعات کی حیثیت سے

”مشکل یہ ہے کہ تمہیں یہ تمام سفر چھوٹے سے کیمبن میں کرنا پڑے گا۔ جہاز میں کوئی کمر نہیں جہاں تم آرام سے رہ سکو۔“

”میں ہر حال میں تیار ہوں۔ بے آراہی کی مجھے پروا نہیں۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ میں معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لوں گا۔“

ڈارون تیار ہو گیا تھا۔ اب ایک مرحلہ یہ تھا کہ اس کے والد کو کیسے تیار کیا جائے کہ وہ اسے اجازت دے دیں۔ اس کے لیے ڈارون نے یہ تجویز پیش کی کہ پروفیسر ہنسلو خود اس کے والد سے ملیں۔

”میرے والد کی یہ عادت ہے کہ وہ بڑے اور باعزت لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کی بات پر عمل بھی کرتے ہیں۔ آپ میری سفارش ان سے کریں گے تو وہ ضرور مان جائیں گے۔ آپ کی موجودگی میں مجھے ڈانٹ بھی نہیں سکیں گے۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوگا کہ میں دوسرے نوجوانوں کی طرح سیر پانے کے لیے نہیں جا رہا ہوں بلکہ یہ ایک علمی دورہ ہے۔“

پروفیسر ہنسلو نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور مسٹر رابرٹ سے ملاقات کے لیے اسکاٹ لینڈ گئے۔ ڈارون بھی کسی سعادت مند شاگرد کی طرح ان کے ساتھ تھا۔

پروفیسر ہنسلو اس کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھے تھے۔ ڈارون نے اپنے والد کو بتایا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ان سے ملاقات کے لیے آئے ہیں تو حسب توقع وہ تقریباً اچھل پڑے۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ آدمی کو باعزت ہونا چاہیے۔ باعزت لوگ اسی وقت اس سے ملنے آتے ہیں۔ میں اگر ماہر طبیب نہ ہوتا تو پروفیسر ہنسلو مجھ سے ملنے آتے؟ تم انہیں بھٹاؤ۔ میں وہ لباس پہن کر آتا ہوں جو بڑے لوگوں کے سامنے پہن کر جانا چاہیے۔“ انہوں نے لباس تبدیل کیا اور پروفیسر ہنسلو سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔

”آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ چارلس ڈارون آپ کا بیٹا ہے۔“

”یہ آپ کہہ رہے ہیں۔ آپ جیسا ذہین پروفیسر۔ اب تک تو اسے جتنے اساتذہ ملے ان کا خیال یہی تھا کہ یہ ایک تالائق طالب علم ہے۔“

”اُس وقت ہوگا مگر اب نہیں ہے۔“

تھا کیونکہ اس جہاز پر صرف فوجی افسران ہی سوار تھے۔ پروفیسر ہنسلو اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح چارلس ڈارون کو موقع مل جائے۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح کیمپٹن رائے تک رسائی حاصل کر لی۔ ”آپ کے اس دورے کے مقاصد کیا ہیں۔“

”دنیا کو برطانوی رائل نیوی کی طاقت سے مرعوب کرنا اور جغرافیائی معلومات حاصل کرنا۔“

”کیمپٹن رائے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے اس جہاز پر کوئی سائنس دان بھی سوار ہے؟“

”اس طرح تو آپ ایک اہم حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ کسی سائنس دان کو ساتھ لیے بغیر آپ اہم معلومات حاصل نہیں کر سکیں گے۔ آپ کے ساتھ تو سائنس کے ماہرین کی ایک ٹیم ہونی چاہیے تھی۔ کسی سائنس دان کے بغیر آپ ان پانچ برسوں کے طویل سفر میں چند نقوش کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔“

”آپ کی بات تو میری سمجھ میں آگئی ہے لیکن بات یہ ہے کہ آپ نے یہ بتانے میں بہت دیر کر دی۔ اب تو تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ کوئی کمرایا نہیں جس میں کسی سائنس دان کو ٹھہرایا جاسکے۔“

”آپ کو کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا ورنہ آپ کا یہ دورہ ضائع چلا جائے گا۔ آپ اپنی کالونیوں پر رعب تو جمالیں گے لیکن دنیا کے بیش قیمت ساحلوں سے معلومات اکٹھی نہیں کر سکیں گے۔ اگر سائنس دانوں کی ٹیم ساتھ نہیں لے جاسکتے تو کم از کم ایک ماہر حیاتیات جہاز پر ہونا چاہیے۔“

”مسٹر ہنسلو، ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ میں اپنے کیمبن کا کچھ سامان کم کر لوں اور اس شخص کو وہاں ٹھہرا لوں۔ مگر ایک آدمی بہ مشکل سفر کر سکے گا۔ کوئی بھی معقول شخص ایسے چھوٹے کیمبن میں اتنے عرصے تک کیسے سہر کر سکے گا؟“

”آپ فکر نہ کریں، میں اس شخص کو تیار کر لوں گا۔“

پروفیسر ہنسلو نے ڈارون سے ذکر کیا تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ کشتیوں میں سوار ہو کر سمندروں میں جاتا رہا تھا لیکن کشتیاں اتنی دور نہیں جاسکتی تھیں۔ یہ خیال ہی اسے بے چین کرنے کے لیے بہت تھا کہ وہ پوری دنیا کے گرد چکر لگائے گا اور نئے نئے ساحلوں پر نئی نئی مخلوقات کا مطالعہ کر سکے گا۔

کہ اب تک فطرت کے مطالعہ سے جو نتائج اس نے اخذ کیے تھے اس کتاب کا مصنف بھی انہی نتائج تک پہنچا تھا۔ ڈارون کو خود پر اطمینان ہونے لگا کہ وہ صحیح سمت کی طرف جا رہا ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر اس کے دل میں تحقیق کا ایک نیا شعلہ بھڑکا۔ ایک جذبہ پیدا ہوا کہ مجھے نیچرل سائنس میں کچھ نیا اضافہ کرنا چاہیے۔ چاہے یہ معمولی نوعیت ہی کا کیوں نہ ہو۔

اس کی بے پناہ دلچسپی کو دیکھتے ہوئے پروفیسر ہنسلو نے اسے ”جیالوجی“ کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ جیالوجی کی کلاسوں میں جانے لگا۔ یہاں اس کی ملاقات پروفیسر سچوک سے ہوئی۔ یہ پروفیسر قدیم چٹانوں پر تحقیق کی غرض سے فیلڈ اسٹڈی پر جاتے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ وہ بھی جانے لگا۔

مذہب میں بی اے کی ڈگری لینے کے لیے تعلیم بھی جاری رہی۔ وہ اس سے پہلے ہی یونیورسٹی چھوڑ کر چلا آتا لیکن دوسری دلچسپیاں اسے یہاں رکھنے پر مجبور کرتی رہیں۔ پروفیسر ہنسلو اور پروفیسر سچوک کی دوستیاں اسے مجبور کرتی رہیں اور اس نے تین برس کا سلیبس مکمل کر کے مذہب میں بی اے کی ڈگری لے لی۔

پادری بننا اس کے مقدر میں نہیں تھا۔ شاید باپ کے کہنے سے وہ ایک ناکام پادری بن بھی جاتا کہ ایک پیش کش اس کے سامنے آگئی۔

برطانیہ کی رائل نیوی کا ایک جہاز ”بیگل“ تحقیقی دورے پر روانہ ہو رہا تھا۔ یہ بحریہ طاقتور ترین بحریہ بھی جاتی تھی۔ سمندروں پر اس کا راج تھا۔ بیگل کا سفر دراصل ایک فوجی مہم تھی۔ دوسرے ملکوں پر طاقت کا اظہار کرنا، مقبوضہ کالونیوں پر فوجی قوت کا رعب جمانا اور ساحلی علاقوں سے متعلق جغرافیائی معلومات جمع کرنا ”بیگل“ کے مقاصد تھے۔

اس جہاز کے کیمپٹن فٹن رائے سے پروفیسر ہنسلو کے اچھے تعلقات تھے۔ پروفیسر ہنسلو نے جب سے سنا تھا کہ ایک جہاز دنیا کے سمندری دورے پر روانہ ہونے والا ہے وہ اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح چارلس ڈارون اس جہاز کے ساتھ چلا جائے اور اپنی تحقیق مکمل کر کے اس کا نچوڑ دنیا کے سامنے پیش کرے۔ ایسا عظیم موقع انفرادی طور پر بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس موقع کا حصول آسان بھی نہیں

اس کا تقرر ہو گیا ہے۔ اسے اس جہاز کے ساتھ جانا ہوگا۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو اسے مل رہا ہے۔“

”پروفیسر ہنسلو! اس قسم کے سیرپائے نوجوانوں کو بگاڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ پھر کوئی سنجیدہ کام کرنے کے لائق نہیں رہتے۔ چارلس بھی اپنا وقت ہی برباد کرے گا۔“

”مجھے معلوم ہے آپ اپنے بیٹے کے مستقبل کی طرف سے پریشان ہیں۔ ایک باپ کو ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ دورہ اس کے مستقبل کے لیے شاندار ہوگا۔ یہ ایسے کارنامے انجام دے سکے گا کہ رہتی دنیا تک اس کا نام رہے گا۔“

اس کے بعد پروفیسر ہنسلو اس کے والد کو تنہائی میں لے گئے اور نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے ان سے کہا۔ ”آپ کا بیٹا آپ کا نہایت فرماں بردار ہے۔ وہ آپ سے اجازت لیے بغیر بھی جاسکتا تھا لیکن وہ آپ کی اجازت کا طالب ہے اور اس نے مجھے ذریعہ بنایا ہے۔ ممکن ہے یہ آپ کی اجازت کے بغیر بھی چلا جائے اس لیے بہتر ہے کہ آپ اسے اجازت دے دیں تاکہ یہ آپ کا احسان مند رہے اور تاریخ میں بھی آپ کا نام زندہ رہ جائے کہ آپ نے ڈارون کو اجازت دی تھی۔“

مسٹر رابرٹ نے بھی سوچا کہ لڑکا جوان ہو گیا ہے اگر روکنے کے باوجود چلا گیا تو وہ کیا کر لیں گے۔ انہوں نے اجازت دے دی۔

27 دسمبر 1831ء کی شام برطانوی بحریہ کا خوبصورت جہاز ”بیگل“ لندن سے روانہ ہوا۔ بندرگاہ پر میلے کا سماں تھا۔ الوداع کے رد مال ہلنے لگے۔ ہاتھوں کے اشاروں سے بوسے دیے گئے اور جہاز نے ننگرا اٹھایا۔ کسے معلوم تھا کہ ایک عظیم نظریہ ساز بھی اس جہاز پر سوار ہے۔ جہاز روانہ ہوا تو کپٹن رائے اس کے پاس آیا۔

”جہاز میں کوئی جگہ نہیں۔ بس اپنی کتابیں لے کر کہیں بیٹھ جاؤ۔“

”مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا“ ڈارون نے کہا اور کہیں میں جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔

جب وہ ہر طرف سے مطمئن ہو گیا تو پروفیسر ہنسلو کو خط لکھنے لگا۔

”میں جو کچھ کتابوں میں پڑھتا تھا اور جو کچھ سوچتا تھا وہ ساری چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ بیگل کے

سفر نے سیکھنے اور سمجھنے کے لیے میرے سامنے ایک بڑی کتاب کھول دی ہے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ بیگل کا سفر میری زندگی کا اہم ترین سفر ہے۔ اس سے قبل میں نے چھوٹی چھوٹی جنگیوں کے مشاہدات کیے تھے۔ کبھی ویلز کے ساحل پر اور کبھی ایڈنبرگ کے مضافات میں فطرت کی تعمیری و تخریبی سرگرمیوں کی کھوج لگانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اس مشق سے مجھے جو تجربہ حاصل ہوا کام آ رہا ہے۔ آتے وقت میں کچھ کتابیں ساتھ لے آیا تھا۔ کچھ کتابیں تو جیالوجی کے بارے میں ہیں۔ ان میں مجھے پروفیسر لائل کی تصنیف ”اصول ارضیات“ سے بہت مدد مل رہی ہے۔ زمین اور چٹانوں کے بارے میں پروفیسر لائل کی تحقیقات بہت عمدہ ہیں۔“

”بیگل“ نے پہلا پڑاؤ جنوبی امریکا کے مشرقی ساحل پر کیا۔ اب مشاہدات کا وقت آ گیا تھا۔ وہ جہاز سے اتر اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کی زیادہ دلچسپی ساحل کے ساتھ جزیروں میں تھی۔ اس کی رائے میں جزیرے بعد میں نمودار ہوئے تھے اور ان جزیروں پر پودے اور جانور ”لینڈ“ سے ہجرت کر کے آباد ہو گئے تھے۔ اس نے جزیروں کی ساخت، ماحول اور حیات میں ربط تلاش کرنے کی کوشش کی۔

فوجی: اپنی موج مستی میں لگ جاتے اور ڈارون جزیرے پر گھومنے کے لیے دور تک نکل جاتا۔ اس نے جزیرے پر پائے جانے والے پودوں اور جانوروں کی مختلف انواع اکٹھی کر لیں۔ ساحل سے سمندری مخلوق کا بڑا ذخیرہ بھی اس کے ہاتھ لگ گیا۔

جب جہاز روانہ ہوا تو اس نے جہاز کے کیمین میں بیٹھ کر جزیرے کی ساخت اور ماحول کے بارے میں اپنے خیالات مرتب کیے۔

اپنا تجربہ لکھا اور پروفیسر ہنسلو کو ارسال کر دیا۔

”ڈی وروے جزیروں کی جیالوجی کا مطالعہ کرتے ہوئے میری رائے ہے کہ اس موضوع پر پروفیسر لائل نے سب سے اچھا لکھا ہے۔ میں نے اس موضوع پر جو کچھ پڑھا ہے اور جتنی کتابیں میرے پاس موجود ہیں ان سب میں پروفیسر لائل کی کتاب ”اصول ارضیات“ میری نظر میں بہترین معاون ثابت ہو رہی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ جزیرے سمندری آتش فشاں اور کورل سے مل کر وجود میں آئے ہیں۔ میری سمجھ کے مطابق ”کورل“ (موٹا)

جو کہ مرتے ہوئے سمندر کی تہ پر یوں بیٹھ گئے جیسے چٹائی کے اوپر دوسری چٹائی بچھا دی۔ اس طرح طویل عرصے تک جاری رہنے والی تہ داری کے نتیجے میں کورل جزیروں کی تعمیر ہوئی رہی۔ ان جزیروں کی تعمیر میں دوسرا عنصر سمندری آتش فشاں ہے۔ سمندر میں آتش فشاں کے نتیجے میں بننے والا لاوا جب کورل تہوں میں شامل ہوا تو کورل تہیں اور لاوا سفید رنگ کی زمین میں تبدیل ہو گئے۔ ان جزیروں کا کچھ حصہ سفید ہے جو کہ نیچے ہے جبکہ اوپر والا حصہ سفید کی بجائے سیاہ ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اوپر والے حصے میں لاوے کی مقدار زیادہ ہے۔ سمندر کا یہ حصہ کورل سے بھر پور ہے۔ یہاں کورل بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ساحل سمندر اور جزیروں کے اطراف میں کورل چٹانیں بڑی تعداد میں دکھائی دیتی ہیں۔

”چلی“ اور ”ایکواڈور“ میں ڈارون نے کئی دن کام کیا۔ اس نے جانوروں اور پودوں کے بارے میں مشاہدات اپنی ڈائری میں درج کیے۔

ایکواڈور سے اس نے بڑے بڑے فاسلز کھود نکالے۔ یہ بڑی بڑی ہڈیوں کے ڈھانچے تھے۔ یہ ڈھانچے قدیم جانوروں کے تھے جو بہت پہلے مر گئے تھے مگر ان قدیم نسلوں کی اولاد زندہ تھی۔ چلی اور ایکواڈور کے جنگلوں میں ”سلوٹس“ (دودھ پلانے والا ایک جانور جس کے چہرے بچوں کی طرح ہوتے ہیں) اور ”آرڈیلو“ (ایک جانور جس پر ہڈی کا خول چڑھا ہوتا ہے) نہایت اطمینان کے ساتھ سرگرم تھیں جبکہ سلوٹس اور آرڈیلو خودناپید ہو گئے تھے۔

ڈارون دیکھ رہا تھا کہ قدیم ڈھانچوں اور ان کی جدید نسلوں میں کئی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ اس نے ڈھانچوں کو زمین سے نکالا صاف کیا اور بور یوں میں ڈال کر جہاز پر لے آیا۔

آرکی پلاگو جزیروں میں ڈارون کی خصوصی دلچسپی اور توجہ کا مرکز چڑیاں اور کھوے تھے۔ چڑیاں ایک جیسی نظر آتی تھیں لیکن ڈارون کی نظر میں سب ایک جیسی نہیں تھیں۔ اس نے اس فرق کا کھوج لگایا۔ دیکھا کہ ایک نسل کی دکھائی دینے والی چڑیوں میں فرق موجود تھا۔ ایک ایک جزیرے میں کئی اقسام کے جھنڈ تھے جن میں کہیں واضح اور کہیں بہت معمولی تغیرات تھے۔ ایک واضح فرق چڑیوں کی چونچ میں تھا۔ کبھی چھوٹی اور درمیانی چونچ۔ کبھی کبھی سیدھی چونچ

اور کبھی طوطے کی طرح نیچے کی طرف مڑی ہوئی چونچ۔ اس سفر میں ایک خاص بات یہ بھی نظر آئی کہ ہر جزیرے کا اپنا مخصوص حیاتیاتی رنگ تھا۔

سارے جزیرے کورل اور لاوے سے بنے تھے مگر ہر جزیرے پر کھجوریں، کیکڑوں، پودوں اور چڑیوں کی اقسام مخصوص تھیں۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ تمام جزیروں پر ایک قسم کے پودے اور پرندے مل جائیں۔ ایک جیسے ماحول میں ایک جیسی حیات کا بسیرا ہونا چاہیے مگر یہاں صورت مختلف تھی۔ حیاتیاتی اعتبار سے کوئی جزیرہ دوسرے جیسا نہیں تھا۔

وہ جب سامان سے لدا پھندا جہاز پر آتا تھا تو کپٹن رائے اور دوسرے فوجی افسران اسے گھیر لیتے تھے اور اس کی تحقیقات کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔

نئے میں ڈولتے فوجی افسران کو اس کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔

”مسٹر ڈارون، ایک ہی ماحول اور ایک ہی سمندر کا حصہ ہونے کے باوجود ہر جزیرہ دوسرے سے مختلف کیوں ہے۔ یہی حال ان جزیروں میں پائی جانے والی مخلوقات کا ہے؟“

کپٹن نے اس سے پوچھا اور ڈارون نے دن بھر کی جھگڑا اتارنے کے لیے جام ہونٹوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ سمندری فاصلوں نے جزیروں کو مستقل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ اس لیے ہر جزیرہ اپنے باسیوں کے لیے اپنی دنیا ہے۔ جزیروں پر سرگرم و متحرک حیات ان جزیروں پر پیدا نہیں ہوئی بلکہ پرانے وقتوں میں جنوبی امریکا سے ہجرت کر کے یہاں پہنچی ہے۔ جزیروں پر مہاجر آباد ہیں۔ ان کے اجداد کی اولاد جنوبی افریقہ کے ملکوں میں آباد ہے۔ ہر جزیرے پر آہا و حیات کی انواع وقت کے ساتھ بدل گئی ہیں اس لیے ان میں مشابہت کا بنیادی رنگ گہرا ہے۔“

اس نے ایک اور مرتبہ گفتگو کرتے ہوئے کہا ”ماحول ایک ایسی قوت ہے جو انواع کی تبدیلی میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔“

اس نے انواع کی تبدیلی کا اصول دریافت کر لیا تھا۔ اس کو بعد میں اس نے پیدائش انواع کے نظریے میں تبدیل کر دیا۔

اگلے چار برسوں میں اس نے دنیا کے گرو چکر لگایا۔ بڑے سکون کے ساتھ وہ جنوبی امریکا کے ساحلوں پر کنارے کنارے چلتا رہا۔ دور دراز گلائو جزیروں پر تحقیقی کام کیا۔ بحرالکاہل کے دیگر جزیروں کی سیر کی۔ وہ بحیرہ عرب اور جنوبی بحر اوقیانوس بھی گیا۔ اس طویل وقفے کے سفر میں اس نے بڑے فطری عجائبات کا مشاہدہ کیا۔ قدیم قبائل سے ملاقات کی۔

وہ اپنے مشاہدوں کو تفصیلاً لکھتا رہا اور یہ تحریریں پروفیسر ہنسلو کو بھیجتا رہا۔ پروفیسر ہنسلو یہ مقالے سائنسی انجمنوں میں پیش کرتے رہے جن پر باہرین بحث و تنقید کرتے تھے۔ اس کے مضامین سائنسی جرائد میں بھی شائع ہوتے رہے۔

اکتوبر 1836ء میں بیگل لندن کے ساحل پر آگیا۔ تقریباً ساڑھے چار برسوں کے دوران ڈارون نے مطلوبہ نمونے جمع کیے اور تحقیقی مقالے مرتب کیے۔ بیگل واپسی کی تیاری کر رہا تھا اور ڈارون نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ یہ ”بیگل“ جہاز ہی تھا جس نے ڈارون کو نظریہ ارتقا دریافت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے یہ مواقع ضائع نہیں کیا تھا چنانچہ جب یہ جہاز لندن کے ساحل پر واپس آیا تو فوجیوں کے ہاتھوں میں نقشے تھے اور ڈارون کے دماغ میں نظریہ ارتقا۔

وہ جب گیا تھا تو چند کتابیں اس کے ساتھ تھیں اور وہ چھوٹے سے لیبن میں مقید تھا۔ واپس آیا تو جہاز اس کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔

پروفیسر جان ہنسلو اس کے استقبال کے لیے ساحل پر موجود تھا۔ ڈارون جو سامان اپنے ساتھ لایا تھا وہ اتنا بیش قیمت تھا کہ کروڑوں روپے خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ڈارون نے اشیائے فطرت کے تمام نمونے پروفیسر ہنسلو کے سپرد کر دیے۔

”یہ تمام نمونے کسی جگہ محفوظ کر دو مگر اس طرح کہ میری دسترس میں رہیں۔ میں ان پر مزید کچھ کام کر کے دنیا کو حیران کرنا چاہتا ہوں۔“

پروفیسر ہنسلو نے یہ تمام نمونہ جات نیچرل ہسٹری میوزیم کو عطا کر دیے۔ ان کے خیال کے مطابق نیچرل ہسٹری پر تحقیق کے حوالے سے یہ اشیاء بہت اہم تھیں۔

ڈارون کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے جمع کردہ نمونہ

جات کے قریب رہے تاکہ ان پر کام کرنے میں آسانی ہو۔ وہ دنیا کے سامنے نظریہ ارتقا پیش کرنے والا تھا۔ وہ اپنے محض خیال کا حصہ نہیں بنانا چاہتا تھا بلکہ سائنس میں تبدیلی کرنا چاہتا تھا۔ اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس شواہد تلاش میں تھا۔ اپنے نظریے کی صداقت پر اصرار کرنے سے پہلے ارتقا کے اصول دریافت کرنا چاہتا تھا جن پر اس کے نظریے کو پرکھا جائے۔ اس کا پیش رو لامارک بھی ”ارتقا“ قائل تھا۔ وہ اپنے موقف میں غلط نہیں تھا لیکن اپنے موقف کی وضاحت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ڈارون یہ غلطی دہرائی نہیں چاہتا تھا۔ وہ فکر کو سائنس بنادینا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ تجربے کا قائل تھا۔ وہ جتنے نمونے جمع کر کے لایا تھا ان کی چھان چھانک کے بعد اسے ثابت کرنا تھا کہ ماحول کی تبدیلی نے ان پر کیا اثرات مرتب کیے۔ ان اشیاء کے بعد اسے انسان تک پہنچنا تھا۔ اسے ثابت کرنا تھا کہ انسان ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ ٹھوس شواہد کے بغیر کون مان سکتا تھا کہ موجود انسان بندر کی ارتقا کی شکل ہے۔ یہ الگ بات کہ اسے بھی نہیں مانا گیا۔

”پست قدم، لمبوتری کھوپڑی، گھوڑے جیسا منہ، چھٹی ناک، نوکیلے دانتوں اور ریچھ کے مانند جسم پر بالوں کی چادر والا بے ڈھنگا انسان ہمارا جدِ امجد ہے۔“

یہ کون مانتا۔ سب سے پہلے اس نے ان پتھروں پر کام کیا جو اس نے جنوبی امریکا کے مختلف جزیروں سے اکٹھے کیے تھے۔ اس نے پروفیسر ملر سے درخواست کی کہ وہ ان پتھروں کی ساخت اور تبدیلیوں کے بارے میں تجزیہ کرنے میں اس کی علمی معاونت کرے۔

جب وہ ایک خاص نتیجے پر پہنچ گیا تھا تو یونیورسٹی کا ایک پروفیسر لائل اس کے کام سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے خیال کے مطابق ڈارون کو چاہیے کہ وہ اپنے سفر کا حاصل مطالعہ ایک مضمون کی صورت میں پیش کرے۔ ڈارون نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور اپنی ڈائری کے صفحات کھول کر بیٹھ گیا۔ راتیں اس کی آنکھوں میں جلی جلتی رہیں۔ اس نے نہایت جانفشانی سے مضمون مرتب کیا اور جیولوجیکل سوسائٹی کے ایک اجلاس میں پیش کر دیا۔ اس مضمون کا بنیادی موضوع ارضی مشاہدات تھا۔ اس کے ایک سال بعد وہ کیمبرج سے لندن منتقل ہو گیا۔

لندن کی مارلبرو اسٹریٹ میں کرائے کا قلیٹ لے کر

اس قلیٹ میں تقریباً بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی بیرونی سرگرمیاں کم ہو گئیں۔ اب وہ اپنے کرائے کے قلیٹ تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ماہرین اور دانشوروں سے اس کے رابطے ضرور تھے لیکن تحقیق کے سوا اب اس کا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔

اب وہ اپنے تحقیقی خاکوں کو مقالوں اور کتابوں کی صورت دینے میں مشغول تھا۔

اب وہ اس خیال پر پوری طرح متفق ہو گیا تھا کہ حیوانی اور نباتاتی انواع غیر چمک پزیر نہیں ہیں بلکہ یہ طبقات الارض کی طویل تاریخ میں طویل عرصے میں ارتقا پذیر ہوئیں۔ اسی دوران اسے تھامس مالٹھس کا مقالہ ”آبادی کے قوانین پر ایک مقالہ“ پڑھنے کو ملا۔ اس مضمون کے مطالعہ سے اسے یہ اشارہ ملا کہ تنازع البقا کے نتیجے میں فطری انتخاب عمل میں آتا ہے۔ اس واضح اشارے کے باوجود اس نے اپنے نظریات کی اشاعت میں عجلت نہ برتی۔ اسے احساس تھا کہ اس نظریہ سے شدید تنازعات پیدا ہو جائیں گے لہذا اس نے ایک طویل عرصہ احتیاط سے شواہد اکٹھے کرنے اور اپنے مفروضے کے حق میں دلائل کو ترتیب دینے میں صرف کیا۔

جب تک وہ سفر میں تھا اس کا طریقہ کار یہ رہا تھا کہ وہ زیر مطالعہ موضوع کا ایک خاکہ تیار کر لیتا تھا۔ اس سے متعلق پرنڈے، کیکڑے، پودے اور پتھروں کے نمونے جمع کر لیتا تھا۔ وہ ابتدائی طور پر معلومات کو ایک خاکے کی صورت میں ترتیب دیتا اور پھر اس میں تفصیلات شامل کر کے مقالہ یا پھر کتاب کی صورت مرتب کر دیتا۔

دو برس تک گھر میں بیٹھ کر وہ یہی کرتا رہا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے سفری مشاہدات کیے۔ سائنسی انجمنوں میں تحقیقی مقالے بحث و تنقید کے لیے پیش کیے۔

اب اسے معروف و متنازع سائنس دان تسلیم کیا جا رہا تھا۔

ڈارون کے والد مسٹر رامبرٹ ابھی تک اسے راستے سے بھٹکا ہوا لڑکا کہتے تھے۔ ایک ایسا آدمی تصور کرتے تھے جسے سب مل کر بے وقوف بنا رہے ہوں۔ جس کا نام تو بہت ہو گیا ہے لیکن آمدنی کے ذرائع محدود ہیں۔ وہ ایک تنازع شخص بن کر رہ گیا ہے۔ وہ اب بھی اس آرزو کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ کاش وہ ایک اچھا طبیب بن گیا ہوتا۔ وہ اسے راہِ راست پر لانے کے لیے تمام حربے استعمال کرتے رہے

تھے۔ اب ایک ہی حربہ باقی رہ گیا تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے لیکن اس بے روزگار آدمی کو بیٹی دے گا کون؟ یہ سوال سامنے آیا تو وہ اس کے سوا کیا کر سکتے تھے کہ وقت کا انتظار کریں۔ انہوں نے ڈارون سے یہ کہا ضرور۔

”اگر تم نے کوئی اچھی نوکری کر لی ہوتی تو میں کہیں بھی تمہارا رشتہ لے کر جاسکتا تھا۔“

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ مجھے کوئی اچھی سی نوکری مل جائے تو کہیں شادی کر ادیتا ورنہ کوئی ضروری بھی نہیں۔“

”تمہیں نوکری کون دے گا۔ میں تو تمہاری شادی کا ارمان لے کر ہی موت کی نیند سو جاؤں گا۔ کیا تم میرے کہنے سے پادری نہیں بن سکتے؟“

”ڈیڈی، میں ایک تحقیق میں مشغول ہوں۔ اس کے بعد میں پادری بن کر بھی دیکھ لوں گا۔“

مسٹر رامبرٹ نے اسے ایک موقع اور دے دیا۔

وہ لندن واپس آگیا اور پھر سے مارلبرو والے قلیٹ میں بند ہو گیا۔ وہ اپنی ایک کتاب Journal of reserches مرتب کر رہا تھا۔ اس کتاب میں اس نے پانچ سالہ سفر کے دوران پیش آنے والے مختلف واقعات بیان کیے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے تحقیقی موضوعات کا اجمالی جائزہ بھی اس میں شامل کرنا تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ اس دوران کوئی اس سے ملنے نہ آئے لیکن ایک روز اس کے دروازے پر اجنبی دستک ہوئی۔ اس نے بے دلی سے دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے اس کی کزن ایما وین ڈو کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اسی لیے ایما وین ڈو کو کہنا پڑا۔ ”چارلی، کیا تم مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، یہ تمہارا ہی تو گھر ہے۔ گھر کی حالت تمہارے شایانِ شان نہیں تھی اس لیے پریشان ہو گیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے سائنس دانوں کے گھروں کی حالت کیا ہوتی ہے۔“ ایما نے کہا اور اندر چلی آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈارون بھی آگیا۔

قلیٹ میں ہر طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک طرف چائے کے برتن پڑے تھے جو شاید کئی دن سے ایک جگہ پر تھے۔ شبِ خوالی کا لباس چارپائی پر تھا۔ زمین پر ایک گدا پڑا ہوا تھا جس پر بھی ہوئی چادر بے ترتیب تھی۔

”افوہ، چارلی، تم تو بہت ہی بے ڈھنگے ہو۔“

”لاؤ یہ چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں رکھ دوں۔“

اس کے بعد تمہارے بیٹھنے کے لیے جگہ ہو جائے گی۔ یا ایسا کرو اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“
ایسا گھوم پھر کر اس کے چھوٹے سے فلیٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔

”فلیٹ اچھا ہے اگر اس میں کوئی عورت ہو جو اسے صاف ستھرا رکھے۔ چارلی تم کوئی ملازمہ کیوں نہیں رکھ لیتے۔“
”وہ ٹکی میری کتابوں کو اٹھا کر ادھر ادھر رکھ دے گی اور یہ مجھے برداشت نہیں ہوگا۔“

”تمہیں اب شادی کر لینی چاہیے۔ ایسی بیوی گھر میں ہو جو تمہیں بھی سنبھال کر رکھے اور تمہاری کتابوں کو بھی۔“

”یہ بتاؤ تم کتنے دن کے لیے آئی ہو۔“
”گھبراؤ مت، میں لندن گھومنے آئی ہوں اور ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں البتہ جب تک ہوں تمہارے ساتھ گھومنا اچھا لگے گا۔“

”کیا تم سمجھتی ہو کہ میرے پاس اتنا وقت ہے؟“
”تم جس انداز سے زندگی گزارتے ہو میں سمجھتی ہوں۔ مجھے کچھ بھی برا نہیں لگے گا۔ اگر تم میرے ساتھ باہر نہیں جاسکو گے تو میں یہیں تمہارے سامنے بیٹھ کر وقت گزار لیا کروں گی۔ سمجھوں گی میں لندن تم سے ملنے آئی تھی۔“

”اب میں اتنا بھی بے مروت نہیں ہوں۔ کہو کہاں چلنا ہے۔“

”آج رات ہم کسی نامیہ کلب میں چلیں گے۔“
ایمانے اس کے فلیٹ کی صفائی کی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کافی پی اور پھر وہ رات کا کہہ کر چلی گئی۔ ان دونوں کو ٹائٹ کلب چلنا تھا۔

ڈارون کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ ایما کی طرف سے آنکھیں بھی نہیں پھیر سکتا تھا۔ وہ پھر سے لکھنے بیٹھ گیا تاکہ وہ ایما کے دوبارہ آنے سے پہلے جتنا کام کر سکتا ہے کر لے۔

وہ شام تک لکھتا رہا اور پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد زمین پر پڑے ہوئے گدے پر لیٹ گیا۔ اس نے پوری طرح کمر سیدھی بھی نہیں کی تھی کہ ڈور بیل نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ایما اسے لینے آئی تھی۔ ”چارلی تم تیار نہیں ہوئے۔“

”تم نے تو ٹائٹ کلب چلنے کو کہا تھا۔“

”کچھ دیر بازاروں میں آوارہ گردی کریں گے۔ کسی جگہ اچھا سا کھانا کھائیں گے۔ اس وقت تک ٹائٹ کلب چلنے کا وقت ہو چکا ہوگا۔“

”ایمانے تم دیکھ رہی ہو ان بے کار کاموں کے لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔“
”کوئی بات نہیں۔ تم اپنا کام کر لو، ہم ڈائریکٹ ٹائٹ کلب چلیں گے۔“

”نہیں میں تمہیں یہ سزا نہیں دے سکتا کہ میں کام کر رہوں اور تم بیٹھی رہو۔ میں لباس تبدیل کر لوں۔ ہم اب چلیں گے۔“

لباس تبدیل کرتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی مختصر بات سننے کے بعد بھی ایمانے کسی خطئی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ منتی اچھی ہے۔ مجھے اس کے لیے وقت نکالنا چاہیے۔ کام ہوتا ہی رہے گا۔

وہ تیار ہو کر نکلا اور ایما کے ساتھ باہر نکل گیا۔ بازار میں گھومتے ہوئے ایمانے محسوس کیا کہ لوگ ڈارون کو جانتے ہیں۔ اسے لوگ غور سے دیکھ رہے ہیں۔ کئی لوگوں نے آکر اس سے ہاتھ بھی ملایا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ پر کھانا کھانے کے لیے بیٹھنے تو ڈارون کو جانتا تھا۔

”چارلی تم تو یہاں بہت مشہور ہو گئے ہو۔“
”اگر وہی مجھے پہچان گیا ہے تو تم اسے مشہور ہونا چاہتی ہو۔“

”مجھے یقین ہے کہ پڑھے لکھے طبقے میں تمہاری اور بھی عزت ہوتی ہوگی۔“
”اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو ڈیڈی کو بھی سمجھاؤ۔ وہ مجھے اب تک نکلا اور تلافی ہی سمجھتے ہیں۔“

”میں انہیں ضرور بتاؤں گی کہ آپ کا بیٹا عنقریب کوئی کارنامہ انجام دینے والا ہے۔“
ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ دونوں ٹائٹ کلب گئے۔ کچھ دیر وہاں گزارنے کے بعد باہر نکلے۔ رات گہری ہو گئی تھی اور غضب یہ ہوا کہ بارش بھی شروع ہو گئی۔ ان کے پاس کوئی سواری تو تھی نہیں۔ بارش میں کھڑے بھیگ رہے تھے کہ پروفیسر ہنسلو فرشتہ بن کر آگئے وہ بھی کلب آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ڈارون کو ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تو گاڑی روٹی۔

”ڈارون، یہاں کھڑے کیا بھیگ رہے ہو۔ جلدی چھوڑی میں بیٹھو۔ وہ ایما کو لے کر ان کی کار میں بیٹھ گیا۔“
”یہ میری کزن ایما ہے۔“ ڈارون نے تعارف کرایا۔

”ایمانے تمہارا شکریہ“ پروفیسر ہنسلو نے کہا۔ ”تم نے اس قیدی کو پنجرے سے نکالا اور ٹائٹ کلب تک لے آئیں۔“

اب اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اسے اس کے ہوٹل تک چھوڑتا۔ وہ اسے لے کر اپنے فلیٹ پر آگیا۔ کچھ دیر کے لیے پروفیسر ہنسلو بھی ان کی محفل میں شریک ہو گئے۔ وہ رات ایمانے ڈارون کے بے ترتیب فلیٹ میں گزاری۔ صبح ہوئی تو وہ اسے کیمبرج میوزیم دکھانے لے گیا جہاں وہ اشیا رکھی ہوئی تھیں جو وہ مختلف ساحلوں سے جمع کر کے لایا تھا۔ ایما یہ سب چیزیں دیکھتی چارلی تھی اور اس کی محنت کی داد دے رہی تھی۔ یونیورسٹی میں جو اس کی عزت ہو رہی تھی وہ اسے بھی بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔

صرف دو دن اس نے ڈارون کے ساتھ گزارے تھے کہ وہ اس سے بے حد متاثر ہو گئی۔ ڈارون کی تنہائی دیکھ کر کڑھتی بھی تھی۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ اگر ڈارون شادی کر لے اور اسے کوئی معقول عورت مل جائے تو ڈارون کو کام کرنے میں کتنی آسانی ہو جائے۔ بالآخر اس نے ڈارون کو کریدنے کے لیے پوچھ ہی لیا۔

”چارلی، شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“
”بقائے نسل انسانی کے لیے شادی بہت ضروری ہے۔“

”اگر تمہیں شادی کرنی پڑ جائے؟“
”میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں کوئی لڑکی میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔ کسی کو ناخوش کرنا کون سی عقل مندی ہے۔“

”اگر کوئی ایسی لڑکی مل جائے جو تمہاری بے ترتیب زندگی سمیت تمہیں قبول کر لے؟“
”پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

دراپرنے یہ کہتے ہوئے اچانک اس کی طرف دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے لیے بات کر رہی ہو۔ اس کے چہرے پر وہی شرم تھی جو ایسی باتیں سننے یا کہتے ہوئے لڑکیوں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ رابرٹ نے اس وقت کچھ

کہنا مناسب نہ سمجھا بلکہ ایک لمحے کو یہ سوچنے لگا کہ اگر ایسا ہو جائے تو کیا برائی ہے۔ ایما اسے کبھی اتنی اچھی نہیں لگی تھی جیسی اس وقت لگ رہی تھی۔

اس کے بعد وہ اس کے ساتھ گھومنے لگا تو اس نے غیر ارادی طور پر ایما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایمانے اس تبدیلی کو محسوس ضرور کیا لیکن اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

”چارلی، تم بہت ترقی کر دے گے، اگر تمہیں ذہنی سکون مل جائے۔ یہ سکون تمہیں شادی کے بغیر نہیں مل سکتا۔“
”تم ٹھیک کہتی ہو ایما۔ اب مجھے کچھ سوچنا ہوگا۔“

ایمانے چلے جانے کے بعد وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایما اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں سوچا تو وہاں سے بھی جواب ”ہاں“ میں آیا۔

وہ اپنی طرف سے کوئی بات کر کے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو ایما پھر مجھ سے ملاقات کرے گی۔

وہ تو نہیں آئی لیکن خلاف توقع ایما کے والد مسٹر جوشوا وڈویج اس سے ملاقات کے لیے آئے اور ایما کا پیغام اسے پہنچایا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔

”آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ میں ایک بے روزگار آدمی ہوں۔“
”اس کے باوجود ایما تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔“

”پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے آپ کو میرے والد سے بات کرنی چاہیے۔“
”ان سے بھی بات کر لوں گا اس وقت تو مجھے تمہاری رضامندی درکار تھی۔“

ڈارون شادی کے لیے تیار تھا تو اس کے والد کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو خود بھی چاہتے تھے کہ ڈارون شادی کر لے۔ چند بڑوں کے درمیان نہایت سادگی سے اس کی شادی ایما سے ہو گئی۔

ایمانے اس کے مزاج سے واقف تھی اور پھر اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی لہذا اسے ڈارون سے بھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اس نے آتے ہی ڈارون کو بھی سنبھال لیا اور اس کے بکھرے ہوئے گھر کو بھی۔ وہ اس کی بہترین مددگار ثابت ہوئی۔

بیگل جہاز سے واپسی کے بعد ڈارون کی زندگی میں تحقیق کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ایما کے آجانے کے بعد زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے متعدد تحقیقی مقالے لکھے اور سائنسی و ادبی انجمنوں میں بحث و تنقید کے لیے پیش کیے۔ لیکن اسے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ کسی بڑی تخلیق کے لیے یہ چھوٹا سا فلیٹ موزوں نہیں۔ ایک بیٹا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی آوازیں فلیٹ میں گونجتی رہتی تھیں۔ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی بڑھ گیا تھا۔ پورا فلیٹ سامان سے اٹا پڑا تھا۔ مہمانوں کو بٹھانے تک کی جگہ نہیں تھی۔ اس نے اہم موضوعات پر کام شروع کر رکھا تھا جس میں پیدائش انواع Origin of species جیسی اہم ترین کتاب بھی شامل تھی مگر وہ صرف تحقیقی مقالے مرتب کر سکا۔ ایما اس کی بے بسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر اس کے شوہر کو پرسکون رہائش گاہ نہیں ملی تو بہت سے خیالات کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے ہی دم توڑ جائیں گے۔ اس نے ڈارون کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی رہائش تبدیل کر لے۔ ڈارون نے اس کی تجویز پر عمل کیا اور مارلبرو اسٹریٹ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے لندن کے مضائقہ قصبہ ڈاون میں ایک اچھا سا گھر خرید لیا۔ یہ نہایت پرسکون جگہ تھی۔ شور کی بجائے خاموشی اور مختلف انواع کے پودوں سے سجا ہوا یہ گھر ڈارون کو اچھا لگا۔ اس گھر میں منتقل ہوتے ہی اس کا تحقیقی کام مناسب طور پر توازن میں آ گیا۔ یہاں رہ کر اس نے بڑے محرکے کے مقالے تحریر کیے۔ وائس وروں، سائنس دانوں اور نوجوانوں میں اس کے مقالوں کی مانگ بڑھتی رہی۔ نہ صرف برطانیہ بلکہ پورے یورپ میں علم دوست حلقہ زندگی و ارتقا کے بارے میں ڈارون کے سائنسی نقطہ نظر کو پسند کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی کتاب جرنل آف تحقیقات فراہمی و جرمن زبان میں ترجمہ ہوئی اور بڑی تعداد میں فروخت ہوئی۔ امریکا میں خاص طور پر پذیرائی ملی۔

ان کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے اس کی ہمت ہوئی کہ وہ اس کتاب پر کام شروع کر دے جس کا آغاز اس نے مارلبرو اسٹریٹ کے فلیٹ میں کیا تھا لیکن وہاں کی پرسکون زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ کام ادھورا چھوڑنا پڑا تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کتاب کی اشاعت سے زبردست تنازع اٹھ کھڑا ہوگا۔ مذہبی طبقہ زبردست طریقے سے اس کے خلاف ہو جائے گا۔ اس لیے از حد احتیاط کی ضرورت تھی۔

کے سر باغدا جاسکتا ہے نہ ویلاس کے سر۔ ان سے پہلے تو لامارک اسی نظریے کو دریافت کر چکا۔ سائنس سوسائٹی اس مسئلے پر تین دھڑوں میں تقسیم ہو گئی لہذا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ عوامی حلقوں میں اس کی کوئی خاص بازگشت سنائی نہیں دی۔ ڈارون کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔

وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈنر کی میز پر بیٹھا تھا اور بہت دن بعد یہ موقع اسے مل سکا تھا۔ اس لیے سب خوش تھے لیکن ڈارون اداس نظر آ رہا تھا۔ اس اداسی کو دور کرنے کے لیے ایما نے اس کے مقالے کا ذکر چھیڑ دیا۔

”چارلی، کیا تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ تمہارے مقالے پر بحث کرنے والے تم سے زیادہ لائق ہیں؟“

”میں ایسا کیوں سمجھنے لگا۔ کیونکہ میں نے اب تک کی پوری زندگی اس نظریے کی کھوج میں لگائی ہے۔ اتنی محنت کسی نے نہیں کی۔ میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے میں اس کا یقینی شاہد ہوں۔“

”یہ دعویٰ تو ویلاس بھی کر سکتا ہے۔“

”بے شک! لیکن وہ اپنے موقف کی اس طرح وضاحت نہ کر سکا جس طرح میں نے کیا ہے۔ اس لیے اب یہ بحث نہیں ہونا چاہیے کہ پہل کس نے کی بلکہ بحث یہ ہوئی چاہیے کہ ٹھوس دلائل کس کے پاس ہیں۔ سوسائٹی نے اس پر غور نہیں کیا۔“

”چارلی، تم اتنے مایوس کیوں ہو۔ اگر تمہیں خود پر اتنا ہی یقین ہے تو اپنے مقالے کو کتابی صورت میں سب کے سامنے لے آؤ۔ دیکھو عوام اور دوسرے سائنس دان کیا فیصلہ کرتے ہیں۔“

ڈارون کھانا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”ایما تم مجھ سے بڑی سائنس دان ہو۔ مجھے اپنا کیس عوامی عدالت میں لے کر جانا چاہیے۔ تم کتنی ذہین ہو۔“

اس دن کے بعد سے ڈارون اپنی محرکہ الآرا کتاب پیدائش انواع Origin of Species مرتب کرنے میں مشغول ہو گیا۔ 1859 میں اس کی یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے ارتقائی اصولوں پر تفصیل سے بحث کی تھی۔

اس کتاب نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ سائنسی موضوعات پر چھپنے والی کسی بھی کتاب کی نسبت اس کتاب کو زیادہ بڑے طبقے نے نہایت جوش و جذبے کے ساتھ موضوع بحث بنایا۔ ان لوگوں میں عوام بھی تھے اور سائنس

دان بھی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے قدامت پسند رجحان رکھنے والے سائنس دان ڈارون کے خلاف سرگرم ہو گئے۔ ان لوگوں کے پاس ڈارون کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کے لیے زیادہ دلائل نہیں تھے لہذا انہوں نے یہی ضروری سمجھا کہ ڈارون کی اہمیت کو کم کیا جائے۔ اس کے مقابلے میں ویلاس کو پہلا نظریہ ساز ثابت کرنے کے لیے کوششیں کی جانے لگیں۔ وہ شاید اس کوشش میں کامیاب ہو بھی جاتے لیکن ویلاس کے ایک خط نے ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ اس نے اس خط کے ذریعے ڈارون کا موقف درست اور مناسب ترین تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جانا چاہیے تھا لیکن رجعت پسند سرگرم رہے۔

ارتقائی عمل کا مطالعہ کرنے کے لیے ڈارون نے چار اصول وضع کیے تھے۔ نیچرل ہسٹری میں کسی بھی منتخب موضوع کا مطالعہ کرنے کے لیے ڈارون کے اصول اوزاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ بحران ممکن ہے مل جاتا اور ڈارون کی جان چھوٹ جاتی لیکن اس نے اپنے لیے گڑھا خود کھود لیا۔ اس کی ایک کتاب ”پیدائش آدم“ Descent of man شائع ہوئی۔ کہا جاتا ہے اس کتاب پر اس نے تیس برس تک کام کیا تھا۔ اس میں اس نے کہا ”دور حاضر کے جدید انسان اور بن مانسوں کے آباؤ اجداد کی تلاش میں نکلیں تو ہم قدیم بن مانس ڈرائیو و پتھی کس تک پہنچ جاتے ہیں جس کی نسل تقریباً ڈیڑھ کروڑ برس قبل تپید ہو گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ڈارون نے کہہ دیا کہ انسان کا ارتقا بندر نما مخلوق سے ہوا۔ ”زعمہ بن مانسوں اور انسان کے مشترکہ آباؤ اجداد“ ڈرائیو و پتھی کس ”بن مانس ہیں“ (ڈارون)

ڈارون کے مطابق جب یہ نسل معدوم ہوئی تو اس کی مختلف شاخیں یا انواع زمین پر بسی رہیں۔ انہی میں ایک نسل ”آسٹرالوپتھی کس“ تھی جسے ڈارون پہلا انسان نما کہتا ہے۔ اس کے مطابق آسٹرالوپتھی کس دو ہاتھوں پر سیدھا چلنے والا انسان نما تھا۔ اس کے کولہوں کی ہڈیاں ایسی ترتیب میں آچکی تھیں کہ اسے سیدھا چلنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا تو ایک بھونچال آ گیا۔

یورپ کے پادری اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے خلاف فتوے آنے لگے۔ پوری تیاری کی جانے لگی کہ کلیسا کی عدالت سے اسے سزا سنائی جائے جس طرح کلیسیا کو سزائے موت سنائی گئی تھی لیکن چارلس خوش قسمت تھا۔ اب

تاریخ عکس

مریم کے خاتم

عکاسی ایک فن کا درجہ رکھتا ہے لیکن اس فن نے کس طرح ترقی کے مدارج طے کیے یہ جاننے کے لائق ہے۔ تصویر کشی جو کبھی مصوری تک محدود تھی اس نے علم کیمیا کے سہارے فوٹو گرافی کا زینہ طے کیا۔

صاحبِ علم کے لیے ایک معلومات بھری تحریر

انسان نے سب سے پہلے اپنی صورت یقیناً پانی کے کسی شفاف اور ٹھہرے ہوئے تالاب میں دیکھی گی اپنا عکس دیکھ کر وہ شروع میں ڈرا ہوگا اور اسے دمن تصور کیا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ وہ جان گیا کہ پانی میں نظر آنے والا دوسرا انسان حقیقت میں وہ خود ہے اور یہ اس کا عکس ہے۔ ابتدائی دور کے سادہ انسان کا ذہن پیچیدگیوں سے پاک تھا اور وہ سامنے نظر آنے والی چیز کو من و عن قبول کر لیتا تھا۔ وہ یہ نہیں سوچتا تھا کہ چیز کیوں ہے اور کس وجہ سے ہے؟ پھر انسان



مئی 2014ء

47

ماہنامہ سرگزشت

میں ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پادریوں میں بھی پھوٹ بڑھتی۔ ایک گروہ اپنے پرانے موقف پر قائم رہا۔ دوسرے گروہ نے اتنی رعایت کر دی کہ اس کے نظریے کو تسلیم کر لیا لیکن ڈارون کو غلط قرار دے دیا۔

”بائبل ارتقا کو تسلیم کرتی ہے۔ ارتقا غلط نہیں ڈارون غلط ہے۔ ارتقا کے بارے میں ساری تفصیل بائبل میں موجود ہے۔ اس لیے ڈارون کا موقف درست نہیں۔“

اس موقف کا فائدہ یہ ہوا کہ مذہبی افراد نے سائنس کو تسلیم کر لیا، کیونکہ پادریوں نے ارتقا کے بارے میں سائنس کو تسلیم کر لیا یہ سائنس کی تشریح مذہبی بنیادوں پر ہونے لگی۔ ڈارون نے اپنے نظریے کی تفصیل علمِ خلق (Genetics) سے استفادہ کے بغیر کی کیونکہ ڈارون کے دور میں کوئی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ کس کس عجیب طریقے سے خاص اوصاف ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہیں۔

انسانی فکر پر ڈارون کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ خالصتاً سائنسی نقطہ نگاہ سے اس نے حیاتیات کے علم میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے نظریے نے علم آثار قدیمہ، عمرانیات، سیاسیات اور معاشیات پر بھی اثرات چھوڑے۔ ایک لادینی سطح پر بھی ڈارون کے نظریات نے دنیا کے متعلق انسانی نقطہ نظر میں عظیم تغیرات برپا کیے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ڈارون کے نظریات کی قبولیت سے مراد مذہبی عقائد کی بے حرمتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے نظریے نے سائنس دانوں کے لیے بہت سی راہیں کھول دیں۔ خصوصاً علم آثار قدیمہ میں اس سے بہت مدد ملی اور سماجی تبدیلیوں کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ اس تنازع سائنس والوں کی وفات 1882ء میں ہوئی۔ اس وقت تک اہم سائنس دانوں کی اکثریت ڈارون کے نظریات کی درستی پر ایمان لا چکی تھی۔

یہ بات اب بھی عوام کو قبول نہیں کہ انسان کبھی انسان نمابند تھا۔ ڈارون کے پیش کردہ ثبوتوں کو چرچ نے ماننے سے انکار کر دیا اس لیے عام لوگ اب بھی ان ثبوتوں کو جھوٹ کا پلندہ قرار دے کر خاموش ہو گئے۔

ماخذات

چارلس ڈارون، پروفیسر طفیل ڈھانہ
سوعظیم آدمی، مترجم: عاصم بیٹ

مئی 2014ء

46

ماہنامہ سرگزشت

زمانہ بدل چکا تھا۔ جاگیر داری کی کمرٹ پھٹی تھی۔ رجعت پسندی کی حامی معاشرتی قوتیں ناکامی سے دوچار ہو رہی تھیں۔ ترقی پسندوں کا طبقہ سامنے آچکا تھا جو ڈارون کے نظریہ ارتقا کے دفاع کے لیے سامنے آ گیا۔ مزدور، تاجر اور صنعت کار سمورے قوتیں بن چکے تھے لہذا پادری کے اختیار میں نہیں رہا تھا کہ پچاسی کا پھندا ڈارون کے گلے میں ڈال دے۔ ڈارون کے دوستوں میں پروفیسر، سائنس دان اور سماجی دانشور شامل تھے۔

پادریوں کی ہنگامہ آرائی جاری رہی۔ جبکہ جگہ مباحثے ہونے لگے۔ ان مباحثوں میں اس کے خلاف تقاریر ہونے لگیں اور ڈارون پر زور دیا جانے لگا کہ وہ اپنے اس نظریے سے تائب ہو جائے لیکن جب بات ہے کہ ڈارون نے ان مباحث میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے اپنے دوستوں پر بھروسہ تھا کہ وہ اس کے نظریات کا پرچار کریں گے۔ خصوصاً اپنے دوست تھامس ایچ ہکسل پر اسے تازہ تھا کہ ہکسل جیسا مشاق مناظرہ باز اس کے محافظ کے طور پر موجود ہے چنانچہ جب آکسفورڈ یونیورسٹی میں مباحثہ ہوا اور اس میں ہشپ سمول نے ڈارون کے لیے یہ الفاظ ادا کیے۔

”ڈارون کہتا ہے انسان بندر کی ترقی یافتہ نسل ہے اس طرح وہ طبع ہماری توہین کر رہا ہے۔ خدا کرے ڈارون کی بات سمجھ میں نہ آئے۔“
تو ہکسل سامنے آیا۔

”یہ ڈارون کا موقف نہیں جو ہشپ بیان کر رہے ہیں بلکہ یہ نظریہ ارتقا کے خلاف پروپیگنڈا ہے۔“ لیکن ہجوم کو پادری کی بات آسانی سے سمجھ میں آگئی۔ ہکسل کو شکست ہوئی۔

پادری اپنی بات کہتے رہے۔
”پیدائش آدم کے بارے میں ڈارون کا نقطہ نظر مذہبی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں ڈارون غلط ہے۔ ہم ارتقا کو نہیں مانتے۔“

آکسفورڈ یونیورسٹی میں مباحثے ہوتے رہے۔ پادری اپنی بات کہتے رہے۔ ہکسل وضاحتیں پیش کرتا رہا۔ وہ ڈارون کا دفاع کرتے ہوئے اتنا بدنام ہوا کہ ”ڈارون کا کتا“ کہلایا جانے لگا۔

اس بحث و تکرار کے سلسلے میں جب وہ معاملہ علمی حلقوں تک پہنچا تو صورت حال بدل گئی۔ فیصلہ ڈارون کے حق

نے تمدن کی طرف قدم بڑھائے۔ شہر بسائے اور زندگی گزارنے کے نئے ڈھنگ سیکھے، نئی نئی چیزیں دریافت کیں اور ایجاد کیں۔ ان میں سے ایک ایجاد آئینہ تھا۔ جو عکس پانی میں کسی قدر دھندلا اور مشکل سے نظر آتا تھا وہی آئینے میں نہایت واضح اور آسانی سے نظر آنے لگا۔ یقیناً آئینہ اس وقت ایک حیران کن ایجاد ہوگا۔

انسان نے مزید ترقی کی اور یہ دریافت کیا کہ پانی اور آئینے میں نظر آنے والا عکس اصل میں روشنی کا انعکاس ہے۔ تاریکی میں یہ عکس نظر نہیں آتا۔۔۔ اور جب کسی چیز پر روشنی پڑتی ہے تو اس کا عکس آئینے میں نظر آتا ہے، بے شک آئینہ مکمل تاریکی میں رکھا ہو۔ اس سائنسی دریافت سے انسان نے عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اپنا اور دوسری چیزوں کا عکس محفوظ کرنے کے لیے انسان نے مصوری کا سہارا لیا۔ رنگوں کی مدد سے وہ چٹانوں، دیواروں اور دوسری اشیاء پر تصویریں بنانے لگا۔ جب تک کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا انسان کھال، کپڑے اور مٹی کی تختیوں پر مصوری کے نمونے بناتا رہا تھا۔ کوئی پانچ ہزار سال پہلے جب انسان متدن ہو رہا تھا تب ہی اس نے رنگوں سے کھینچنا بھی شروع کیا تھا۔

مگر مصوری کرتے ہوئے انسان کے ذہن میں ہمیشہ یہ رہا کہ وہ اصل کی مکمل نقل نہیں کر پا رہا ہے۔ کسی شخص یا منظر کو بالکل اسی طرح کیپٹوں پر منتقل کرنا کسی ماہر ترین مصور کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ بہت سارے خوابوں کی طرح عکس کو مکمل طور پر منتقل کرنا بھی انسان کا پرانا خواب تھا۔ اس کا ثبوت ہمیں اس دور کی کہانوں میں ملتا ہے جب انسان اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے الفاظ کا سہارا لیتا تھا۔ ان کہانوں میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو آج ہمارے روزمرہ کے استعمال میں ہیں لیکن اس وقت انہیں ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ آج ہم جو ناممکن سمجھتے ہیں اسے فکشن کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آنے والے دور میں یہ بھی اسی طرح سچ ہو جائے جیسے آج ہوائی جہاز، ٹی وی اور وائرلیس سے کام کرنے والے مواصلاتی آلات ہیں۔ آج سے کئی سو سال پہلے ہمیں ان کا ذکر کہانوں میں ملتا ہے۔

بالکل اسی طرح عکس محفوظ کرنا بھی انسان کا پرانا خواب تھا۔ اپنی کہانوں میں وہ جادو گروں کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ اس نے کسی انسان یا چیز کا بالکل ویسا ہی عکس کسی پتھر کی دیوار یا شیشے میں محفوظ کرویا جیسا کہ اصل انسان یا منظر تھا۔ یا کسی مخصوص وقت کی مووی بنا کر محفوظ کر لی اور

بعد میں شیشے کے گولے یا آئینے میں دکھادی۔ یہ سب چیزیں جادو گروں سے منسوب تھیں کیونکہ سائنس کس چیز کا نام ہے اس وقت لوگ جانتے نہیں تھے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے سائنس ویسے بھی عام آدمی کے لیے نہیں تھی۔ یہ صرف ایک خاص طبقے تک محدود تھی اور وہی اس کی پرورش کر رہے تھے۔ علم دنوں پر مذہبی پابندیاں تھیں۔ عیسائی دنیا میں اسے مسلمانوں کی بدعت سمجھا جاتا تھا اور اس سے عمل پر ہییز کیا جاتا تھا۔ مزے کی بات آج یہ دور الٹ گیا ہے اب مسلمانوں کے مذہبی طبقات میں اسے مغرب کی بدعت سمجھا جاتا ہے۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ بات ہو رہی تھی عکس محفوظ کرنے کی۔ مغرب میں جب صنعتی ترقی کے بعد نئی چیزیں اور ان کے استعمال سامنے آنے لگے تو عکس کو بھی مستقل محفوظ کرنے کے بارے میں سوچا گیا۔ اس سلسلے میں تحقیق کرنے والوں کی دل چسپی کا مرکز وہ عناصر تھے جن کی کوٹ کی ہوئی پلیٹ پر کوئی بھی عکس آسانی سے اور طویل مدت کے لیے محفوظ کیا جاسکتا تھا۔ اس سلسلے میں شیشے، ٹن اور فولادی پلیٹ پر تجربات کیے گئے۔ کیمیا کے ماہروں نے سترھویں صدی میں ایسے کیمیائی عناصر کی نشان دہی کر دی تھی جن پر روشنی پڑتی تو ان کا رنگ بدل جاتا تھا۔ ایسے کیمیائی عناصر پر تحقیق بھی جاری تھی۔ کیونکہ اس شعبے میں بہت سارے افراد مصروف عمل تھے اس لیے آج ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ درحقیقت کون ہے جو فوٹو گرافی کا موجد ہے۔

اس معاملے میں دو نام تقریباً ایک ہی وقت میں سامنے آتے ہیں۔ پہلا ایک فرانسیسی سائنس دان لوئیس جیکوئیس منڈے ڈی گورے تھا۔ قارئین حیران نہ ہوں اس زمانے میں ایسے ہی طویل نام رکھنے کا رواج تھا۔ اس فرانسیسی ماہر نے 1839 میں اعلان کیا کہ اس نے فوٹو گرافی ایجاد کر لی ہے یعنی کسی چیز یا شخص کا عکس بالکل ویسا ہی ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ اسی سال ایک برطانوی سائنس دان ولیم ہنری فوکس ٹالیوٹ نے بھی کچھ ایسا ہی کر کے دکھایا۔ اتفاق سے اس وقت یہ دو مالک سائنس کے شعبے میں سب سے آگے تھے اور ان سائنس دانوں میں چیزوں کی ایجاد اور دریافت کی دوڑ لگی رہتی تھی۔ فرانس اور برطانیہ اس وقت شدید قسم کے دشمن تھے اور ان میں سو سالہ جنگ بھی جاری تھی۔ یہ جنگ دنیا کے مختلف علاقوں پر قبضے کی

دوڑ میں بھی بدل مٹی تھی۔

لوئیس نے اپنی ایجاد کو Daguerre type (ڈی گورے ٹائپ) کا نام دیا۔ جب کہ ولیم نے اپنی ایجاد کا نام Calo type (کالو ٹائپ) رکھا۔ ایک ہی کام کے لیے دونوں کا طریقہ کار بالکل مختلف تھا اس لیے آج ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے دوسرے کی نقل نہیں کی تھی اور وہ اپنے اپنے شعبے میں الگ مصروف عمل رہے تھے۔ یقیناً وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز ایجاد کی۔ لوئیس کی ڈی گورے ٹائپ میں دھات کی ایک پالش کی ہوئی پلیٹ پر کیمیائی عناصر کی تہ چڑھا کر اس پر مدد سے کسی شخص، منظر یا چیز کا عکس ڈالا جاتا تو وہ اسی وقت پلیٹ پر محفوظ ہو جاتا۔ اس طریقے میں عکس الٹا یعنی دائیں سے بائیں ہو کر محفوظ ہوتا تھا اور فی الحال اسے سیدھا کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اس خرابی کے ساتھ اس میں تصویر کا معیار بھی اچھا تھا اور دھاتی پلیٹ پر عکس طویل عرصے پر قرار رہتا تھا۔ اس میں ایک خرابی اور تھی کہ تصویر کو دوبارہ حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بس جو ایک بار پرنٹ ہو جاتی تھی وہی تصویر حاصل ہوتی۔

کالو ٹائپ میں ولیم ہائیڈروکس کو ایک کاغذ پر لپیٹا اور لیتا اور یوں درست تصویر حاصل ہوتی تھی۔ اس میں تصویر کا معیار بھی بہت اچھا ہوتا تھا اور اسے بار بار پرنٹ کیا جاسکتا تھا۔ خرابی اس میں وہی تھی کہ تصویر کچھ عرصے بعد دھندلانے لگتی تھی۔ یہ ہوا اور روشنی کا اثر تھا جس سے عکس محفوظ رکھنے والے کیمیائی عناصر رنگت تبدیل کی کا عمل جاری رکھتے تھے جس سے تصویر اپنا اصل عکس کھودتی تھی۔ ابھی تک کیمیائی عناصر کو تبدیل کرنے سے روکنے کا کوئی طریقہ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ لوئیس اور ولیم کی یہ ایجادات فوری مقبول ہو گئیں۔ لوئیس نے اپنا پینٹ فرانس کی پارلیمنٹ کو فروخت کر دیا جس نے اسے مفاد عامہ کے لیے عام اور مفت کر دیا۔ اس کے مقابلے میں ولیم اپنی ٹیکنالوجی رقم کے عوض کمپنیوں کو دینے لگا اور اس نے پینٹ اپنے پاس رکھا تھا۔

کالو ٹائپ بہتر ہونے کے باوجود عوام میں ڈی گورے ٹائپ مقبول ہونے لگا۔ اس کی ایک وجہ تو تصویر کا بہت زیادہ جھٹکا ہونا تھا۔ دھات کی پلیٹ دیر پا ہوتی تھی۔ مگر اس میں یہ مسئلہ بھی تھا کہ اس کے کیمیائی عناصر بہت حساس تھے اور اگر پرچہ ذرا سی دیر کے لیے بھی کھلا رہ جاتا تو پلیٹ

جل اٹھتی تھی اور عکس ضائع ہو جاتا۔ تصویر لینے کے بعد بھی یہ عکس روشنی اور دھول سے حساس تھا۔ اس لیے تصویر کو تاریکی میں اور ہوا بند جگہ رکھنا ہوتا تھا۔ اسے کم روشنی میں دیکھنا پڑتا تھا۔ ان خرابیوں کے باوجود ڈی گورے ٹائپ عوام میں مقبول تھا۔ اس کی بنیادی وجہ اس کا سستا ہونا تھا۔ پینٹ فری ہونے کی وجہ سے بے شمار لوگوں نے اس کے کیمرے بنانا کر پینٹ شروع کر دیے تھے۔ دھاتی پلیٹ بھی مہنگی نہیں تھی۔ کالو ٹائپ محدود تھا اور اس کا استعمال بھی محدود تھا اسے عوام میں پزیرائی نہیں ملی تھی۔ کیونکہ جو کمپنیاں ولیم سے استعمال کا لائسنس لیتی تھیں وہ لوگوں کی کمال چھٹی تھیں۔ برطانوی ویسے بھی تاجروں میں ہیں۔

ایک دفعہ فوٹو گرافی حقیقت بن کر سامنے آئی تو مزید سائنس دان اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ ان میں ایک انگریز سائنس دان فریڈرک اسکاٹ آرچر بھی تھا۔ اس نے فوٹو گرافی کا ایک نیا طریقہ نکالا۔ یہ کولوڈین کی کھلی پلیٹ تھی۔ اصل میں یہ شیشے کی پلیٹ تھی جس پر کولوڈین کا گھیلا مسالا لگایا جاتا تھا۔ یہ مسالا نائٹرو سیلیوس کو الکل حل یا اسی جیسے کسی سلوشن میں حل کر کے تیار کیا جاتا تھا۔ اس کی حساسیت کم کرنے کے لیے اسے سلور نائٹریٹ میں ڈبو کر رکھا جاتا تھا۔ مگر اس میں ایک خرابی تھی جیسے ہی پلیٹ کو ٹکھول سے نکالا جاتا اور اسے ہوائی تو یہ بہت تیزی سے ڈیولپ ہو جاتی تھی اور اس سے مزید کاپیاں بنانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس میں ایک مسئلہ اور تھا شیشے کی پلیٹ نازک اور وزنی ہوتی تھی۔ اسے بہت احتیاط سے رکھنا پڑتا تھا مگر اس سے تصویر کے وقت کے ساتھ دھندلانے کا مسئلہ حل ہو گیا تھا اور اگر تصویر کی حفاظت کی جاتی تو برسوں بعد بھی عکس دیباہی ہوتا۔ یہ ایجاد اس لحاظ سے قابل قدر تھی۔

چند سال بعد 1856 میں ایک ماہر فوٹو گرافی ہملٹن اسمتھ نے دریافت کیا کہ کولوڈین کا مسالا صرف شیشے کی پلیٹ ہی نہیں بلکہ تمام ہموار سطح رکھنے والی اشیاء جیسے دھات یا چمچے پر بھی یکساں آسانی سے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اسمتھ نے اپنے خیال کو عملی جامچ پہنانے کے لیے بہت باریک شن کی پالش کی ہوئی پلیٹ لی اور اس پر کولوڈین کا مسالا لگا کر اسے کیمرے میں رکھا اور جب تصویر لی تو نتیجہ بہترین نکلا۔ شیشے کے مقابلے میں بہت پکلی اور ہلکی شن کی شیٹ پر تصویر اتر آئی تھی۔ یہ سستی بھی تھی اس لیے اسمتھ کا طریقہ چل نکلا اور چند برسوں میں عوام و خواص سب

تصویریں لینے لگے اور اپنے گھروں میں سجانے لگے۔ تصویر سازی کی صنعت بن گئی۔ فیکٹریوں میں بڑی سینریاں اور تصاویر بننے لگیں جنہیں عام لوگ بھی آسانی سے خرید سکتے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا جب نکل بند صنعت کے طور پر سامنے آئی۔ ہوشیار لوگوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور سلائیڈ شوز چلانے شروع کر دیے۔ ان سلائیڈ شوز میں آوازوں اور تصویروں کی مدد سے پوری کہانی یا واقعہ بیان کیا جاتا تھا۔ فوٹو گراف ساری دنیا میں گھومنے لگے اور نادروں یا اب چیزوں کی تصاویر بنا کر مغربی دنیا میں بیچنے لگے۔ لوگ ان سلائیڈ شوز پر ٹوٹ پڑے تھے اور بالکل وہی حال ہوا تھا جو آج کسی نئی فلم کی ریلیز کے موقع پر ہوتا ہے۔ مغربی دنیا میں جنسی آزادی اور بے راہ روی شروع سے تھی۔ وہاں سلائیڈ شوز کرنے والوں نے عریاں اور خشن سلائیڈ شوز چلانے شروع کر دیے۔ مخصوص ذہنیت کے لوگ اس پر بھی ٹوٹ پڑے تھے۔ تعمیر زبھی اس صنعت سے استفادہ حاصل کرنے لگے۔ ہاتھ کی بنی سینریوں کی جگہ تصاویر نے لے لی۔ اس طرح تعمیر زکی پلٹی بھی آسان ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے پہلے یہ سب بہت مقبول ہو چکا تھا۔ مغربی دنیا کے لوگ یہ ٹیکنالوجی لے کر مشرقی ممالک میں بھی آئے۔ آج برٹش میوزیم میں برصغیر کی جنگ آزادی کی اصلی تصاویر موجود ہیں۔

نکل بندی کی اتنی ترقی کے باوجود ابھی اس کے پہلاؤ میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ اول یہ سستی نہیں تھی۔ مغرب میں بھی ہر شخص فوٹو گرافی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری آسان نہیں تھی۔ تصویر سازی کے لیے باقاعدہ فیکٹریاں لگانی تھیں۔ تیسرے ابھی تک اسے کاغذ پر منتقل نہیں کیا جا سکا تھا۔ ہاں مونے گتے پر تصویر بنتی تھی۔ اس وجہ سے تصاویر اب تک اخبارات اور رسائل کی زینت نہیں بنی تھیں۔ ابھی تک کوئی ایسا پریس ایجوانہیں ہوا تھا جو تصاویر کو اخبار یا رسالے کے کاغذ پر چھاپ سکتا۔ ایک صدی گزرنے کے بعد آج یہ کہنا مشکل ہے کہ سب سے پہلے کس اخبار یا رسالے نے تصویر چھاپی اور وہ کس ملک سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اولین تصویر جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ کسی اخبار یا رسالے میں چھپی، ایک نامعلوم فوٹو گرافر نے امریکی فوج کے دستوں کی لی تھی۔ یہ دستہ 1847 میں فلپائن میں تھا اور یہ تصویر بعد میں متعدد رسالوں اور

اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ سب سے پہلے کب شائع ہوئی تھی۔ ممکنہ طور پر یہ 1880 سے 1897 کا درمیانی وقت ہے جب لیتھو پریس کی ٹیکنالوجی سامنے آئی تھی۔

سابق سوویت یونین کے دور میں دعویٰ کیا جاتا رہا کہ اولین تصویر جو کسی رسالے یا اخبار میں چھپی وہ رومانیہ کے ایک فوٹو گرافر صحنائی کارل زیتھ میری کی تھی جو اس نے جنگ کریمیا کے دوران لی تھی۔ یہ جنگ روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان 1853 سے 1856 کے درمیان جاری رہی تھی۔ کارل صحنائی کی حیثیت سے اس جنگ کی کوریج کر رہا تھا۔ سوویت یونین کے دعویٰ کے مطابق یہ تصویر 1880 میں ماسکو کے ایک اخبار نے شائع کی تھی مگر اس دعویٰ کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے کیونکہ اس اخبار کی تصویر والی صرف ایک کاپی ماسکو میوزیم میں موجود ہے۔ مغربی دنیا کے ماہرین نے اسے سوویت یونین کی جعل سازی قرار دیا تھا جو اس نے یہ اعزاز حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔

اسمجھ کے ایجاد کردہ طریقے نے تصویر سازی کو عروج بخشا تھا کیونکہ ٹن سستا، ہلکا اور آسانی سے بن جانے والی دھات ہے۔ اسے کسی بھی سائز میں بنایا جاسکتا ہے۔ اس پر تصویر کا معیار بھی بہت اعلیٰ آتا تھا۔ اس وقت فوٹو گرافی کے ماہرین کا خیال تھا کہ اس شعبے میں اب ترقی کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے اور اس نے جتنی ترقی کرنی تھی وہ کر لی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کاغذی تصویر کا دور بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی اور ابھی کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بھی رنگین تصویر بھی آئے گی۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس وقت ماہرین کی سوچ کتنی محدود تھی۔ وہ ٹن پر عکس اتارنے کو اس فن کی معراج تصور کر رہے تھے۔ جب کہ فوٹو گرافی کے فن میں نئی ایجادات کا سلسلہ ابھی رکائیں تھا۔

1888 کا سال فوٹو گرافی کے فن میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی سال ایک امریکی جارج ایسٹ مین نے اپنی کمپنی ایسٹ مین کوڈک کے نام سے کھولی۔ ابتدا میں اس کمپنی نے پلیٹیں ڈرائی پلیٹ بنا کر فوٹو گرافی کے فن کو ایک نئی جدت دی۔ یہ خشک پلیٹ محفوظ تھی، آگ نہیں پکڑتی تھی اور اس پر اتارا جانے والا عکس تا دیر قائم رہتا تھا جس سے اس کی مزید کاپیاں بنائی جاسکتی تھیں۔ یہ ظاہر یہ بہت انقلابی قسم کی ایجاد تھی جس سے فوٹو

گرافی کی صنعت کئی گنا بڑھ سکتی تھی مگر جارج ایسٹ مین کے دماغ میں کچھ اور ہی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تصویر سازی کو دو الگ مراحل میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگرچہ اس وقت بھی یہ کام دو مراحل میں ہو رہا تھا لیکن حقیقت میں یہ دونوں مراحل گتھے ہوئے بھی تھے۔ انہیں مکمل طور پر الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جارج ایسٹ مین نے ولیم ہنری فوکس ٹالپوٹ کے ایجاد کردہ فوٹو پریس کا جائزہ لیا اور اس نے محسوس کیا کہ اسے مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد چمک دار ہے۔ اگر تصاویر کے لیے حساس مادوں کو کسی نرم اور شفاف مادے پر لگا کر تصویر لی جائے تو نتیجہ بہتر نکل سکتا تھا۔ جارج ایسٹ مین کی کوششوں سے ایک نئی ٹیکنالوجی سامنے آئی۔ یہ فلم رول تھا جس پر ایک کے بجائے متعدد تصاویر بنائی جاسکتی تھیں۔ چاول کے چھلکے سے تیار ہونے والا یہ مادہ بہت سستا آسان اور کم جگہ گھیرنے والا تھا۔ اس پر آنے والا ٹیکو آسانی سے کسی کاغذ پر پازینڈ کی صورت میں اتارا جاسکتا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے کیمرے میں کس طرح استعمال کیا جائے۔ کیونکہ مروجہ کیمرے صرف مخصوص قسم کی پلیٹیں استعمال کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑے اور بھاری بھر کم ہوتے تھے۔ انہیں ہاتھ سے اٹھانا بھی ممکن نہیں تھا بلکہ انہیں ٹرائی اسٹینڈ پر رکھا جاتا تھا۔

جارج ایسٹ مین نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اس نے ایک ایسا کیمرا ایجاد کیا جس میں فلم رول آسانی سے استعمال ہو سکتا تھا۔ یہ کیمرا استعمال میں اتنا آسان تھا کہ ایک بچہ بھی اس سے تصویر اتار سکتا تھا۔ یہ چھوٹا اور کم وزن کیمرا تھا جسے آسانی سے کہیں بھی لے جایا جاسکتا تھا۔ سب سے بڑی بات تھی کہ اب لوگ بڑی فلم پلیٹوں کے محتاج نہیں رہے تھے۔ ٹن کی پلیٹ بھی بڑی ہوتی تھی۔ اسے کیمرے میں لوڈ کرنا اچھا خاصا مشکل کام تھا اور تصویر لینا بھی آسان نہیں ہوتا تھا۔ جارج ایسٹ مین کے کوڈک کیمرے نے یہ تمام مشکلات دور کر دی تھیں۔ اب کیمرا جدید، ہلکا اور استعمال میں آسان ہونے کے ساتھ ایک ہی فلم رول میں سو سے بھی زیادہ تصاویر محفوظ کر سکتا تھا۔

پس منظر کے لحاظ سے جارج ایسٹ مین ایک ناکام اسکول گریجویٹ لیکن تکنیکی اور کاروباری لحاظ سے نہایت ذہین شخص تھا۔ اس نے فلم رول اور کیمرا ایجاد کر لیا تھا لیکن وہ جانتا تھا جب تک عوام کو یہ سہولت نہیں ملے گی کہ ان کی

کھینچی ہوئی تصاویر جلد پرٹ ہو کر مل جائیں تب تک کیمرے اور فلم رول کی افادیت بیکار تھی۔ اس لیے جارج ایسٹ مین نے شروع میں جو کیمرے بنائے ان میں فلم رول اس کی فیکٹری میں لوڈ ہوتا تھا اور پھر یہ کیمرا ایک بار کسی شخص کو فروخت کر دیا جاتا تھا۔ خریدنے والا جب پورا رول استعمال کر لیتا تو وہ کیمرا واپس کوڈک کی ایکسپریس شاپ پر لے جاتا جہاں سے اسے فیکٹری بھیج دیا جاتا۔ فیکٹری میں رول نکال کر ڈیولپ کیا جاتا اور پھر اس سے تصاویر بنا کر واپس مالک کے لیے بھیج دی جاتیں اور اگر وہ فرمائش کرتا تو کیمرے میں نیا رول بھی لوڈ کر دیا جاتا۔

جارج ایسٹ مین کی یہ ترکیب کامیاب رہی اور لوگوں نے دھڑا دھڑ کوڈک کیمرا اور فلم رول خریدنا شروع کر دیا۔ جب بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو امریکا اور باقی دنیا میں فلم رول کیمرا مقبول ہو چکا تھا۔ خاص طور سے امریکا میں تو یہ ایک فیشن کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ وہاں لاکھوں لوگوں نے یہ کیمرے خریدے اور استعمال کیے۔ کوڈک نے اپنا سلوگن رکھا تھا۔ ”آپ بس شٹن دبائیے اور باقی کام ہم پر چھوڑ دیں۔“

لوگوں نے سچ سچ باقی کام کوڈک کمپنی پر چھوڑ دیا۔ اس کا کیمرا اور فلم پرڈیس اتنا سستا تھا کہ غریب آدمی بھی برداشت کر سکتا تھا۔ شروع میں فلم رول بہت حساس ہوتے تھے اور معمولی سی بے احتیاطی سے خراب ہو جاتے تھے اس لیے فیکٹری میں انہیں مخصوص طریقہ کار کے تحت ڈیولپ کیا جاتا تھا۔ مگر جلد کوڈک کمپنی نے ایسے فلم رول بنائے جو پائیدار تھے اور ایک عام آدمی بھی انہیں آسانی سے کیمرے میں ڈال سکتا تھا اور پھر نکال کر خود ڈیولپ کر سکتا تھا۔ یہ شرطیک اس کے پاس اس کام کے لیے مناسب جگہ اور سامان ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ نیا رول اور نئے کیمرے مقبول ہو گئے۔ ان لوگوں کی آسانی کے لیے جو خود سے فلم ڈیولپ نہیں کر سکتے تھے جگہ جگہ کوڈک کی لائسنس یافتہ فوٹو شاپیں کھل گئیں۔ یہ اعلیٰ معیار کے کاغذ پر بہترین تصاویر کم داموں میں دینے لگیں۔

ماہرین کا خیال تھا کہ اس نئی ایجاد سے کوڈک کمپنی کا منافع کم ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس کمپنی پہلے سے کئی گنا زیادہ نفع کمانے لگی۔ اس نے اپنی ساری توجہ کیمرا سازی اور فلم سازی پر مرکوز کر لی۔ اس کی فروخت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اسی لحاظ سے اس کا نفع بھی بڑھ گیا۔ کمپنی جلدی

سرگزشت

ماہنامہ

کی ایک اور قابل فخر پیش کش

خط نمبر

انسان خطا کا پتلا ہے غلطی ہماری سرشت میں داخل ہے
بڑے لوگوں کی چھوٹی اور چھوٹے آدمیوں کی ایسی بڑی غلطیاں
جنہوں نے تاریخ، وقت، زندگی اور حالات کا دھارا بدل دیا
دلوں کو چھو لینے والی سچ بیابیاں دلچسپ قصے اور انوکھی
وارداتیں ہر تحریر آپ کو حیرت زدہ کر دے گی

یہ ایک ایسا خاص شمارہ ہے جسے آپ مجلد کر کر محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

بہت جلد آپ تک پہنچ رہا ہے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر یہ شمارہ مختص کرالیں

استعمال میں آسان، سستے اور بہت اسٹاکش تھے۔ سب سے پہلے جاپانیوں نے کیرے میں فلفل لائٹ متعارف کرائی اور ڈرائی بیٹری سے چلنے والے کیرے وجود میں آئے۔ ان سے تصویر لینا آج بہت آسان ہو گیا۔ ایک چار پانچ سال کا بچہ بھی تصویر اتارنے لگا تھا۔ آج جاپان کیرا سازی میں لیڈر ہے۔ دوسرے ممالک کی کمپنیاں جاپان کی کمپنیوں سے کوسوں پیچھے ہیں۔

عکس کی دنیا میں ایک انقلاب تو عکس کو کسی چیز پر محفوظ کرنا تھا لیکن ایک دوسرا خواب عکس کو حرکت میں منتقل کرنا تھا یعنی جیتا جاگتا، بولتا اور حرکت کرتا ہوا عکس۔ یہ اصل میں ٹی وی کا خواب تھا جو قدیم دیومالا کی داستانوں نے انسان کو دکھایا تھا۔ اس کو حقیقت کا روپ جان لو کی ہیر پریٹ نے دیا۔ اس نے 1926ء میں پہلی بار برقی سٹیل کو تصویر کی منتقلی کے لیے استعمال کیا۔ اس تجربے میں اس نے اپنے دوست اور کاروباری شریک اولیور ہیکمن سن کی مدد کو ٹرانسمٹ کیا۔ اس سادہ سے تجربے نے برقی عکس کی بنیاد رکھی جو آج ترقی کرتے ہوئے ڈیجیٹل فوٹو گرافی تک آ پہنچا ہے۔ پچاس کے عشرے میں ٹی وی کا آغاز ہوا۔ جان لو کی ہیر پریٹ جنگ عظیم کے فوراً بعد موت کی نیند سو گیا تھا لیکن اس کی ایجاد آگے بڑھتی رہی اور یہ عشرہ ختم ہونے سے پہلے ٹی وی کی کمرشل نشریات کا آغاز ہو گیا تھا۔

اسی عشرے میں عکس یا کسی بھی معلومات کا ایسا لوگ ریکارڈر وجود میں آیا۔ یہ اسی میٹرل کو بہ طور ریکارڈر استعمال کرتا تھا جس سے فلم بنی تھی۔ بعد میں یہ چیز ویڈیو کیسٹ کی صورت میں سامنے آئی جس میں ریکارڈنگ ٹیپ ہوتی تھی۔ سی ڈی کی آمد سے پہلے یہ سب سے زیادہ استعمال ہونے والی چیز تھی۔ مقناطیسی طریقے سے کسی بھی معلومات کو اس ٹیپ پر محفوظ کر لیا جاتا تھا اور پھر اسے دوبارہ سے واپس حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس ایجاد نے ٹی وی کی نشریات کو ممکن بنا دیا۔ یوں عکس اب بغیر کسی مادی وسیلے کے بھی صرف ریڈیائی مقناطیسی لہروں کی صورت میں بھی محفوظ کیا جاسکتا تھا اسی ٹیپ نے کمپیوٹر کی ایجاد کو بھی ممکن بنایا تھا۔ ساٹھ کے عشرے میں ٹی وی کی ٹیکنالوجی نے مزید ترقی کی اور رنگین ٹی وی سامنے آیا۔

اس ترقی کے باوجود ابھی عکس بندی کا ڈیجیٹل طریقہ سامنے نہیں آیا تھا۔ عکس بندی کی دنیا اور فلم سازی میں فلم رول کا راج تھا۔ اس نے معیار بہت اعلیٰ دیا تھا اور یہ سستا

جلدی بننے ڈیزائن کے اور نئی سہولیات کے ساتھ کیرے نکالنے لگی۔ صرف عام لوگوں کے لیے ہی نہیں بلکہ مختلف شعبوں میں کام کرنے والے ماہروں کے لیے ان کی ضرورت کے لحاظ سے کیرے بنائے گئے۔ جلد امریکی فوج کوڈک کی سب سے بڑی گا ہک بن گئی تھی۔ حکومتی شعبوں کے سارے ٹھیکے بھی کوڈک کے پاس تھے۔ جارج ایسٹ مین دیکھتے ہی دیکھتے امریکا کے امیر ترین آدمیوں میں شامل ہو گیا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ فوٹو گرافی کا تمام کام سمٹ کر کوڈک کمپنی کے پاس آ گیا ہے ساری دنیا میں اس کے کیرے چل رہے تھے۔ اس کے بنائے ہوئے فلم رول استعمال ہو رہے تھے اور فوٹو شاپس والے اپنی دکان کے نام میں فخر سے کوڈک کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ کوڈک کمپنی نے عام لوگوں کو اپنے کاروبار میں شامل کیا اور طویل عرصے تک اس شعبے پر حکمرانی کی۔ خاص بات یہ تھی کہ کمپنی کے کارپوریٹوں نے بروقت لوگوں کی ضروریات کو بھانپ کر اسی لحاظ سے نئی چیزیں متعارف کرائیں۔ کمپنی نے فوج کے ساتھ اشتہاری اور اخباری صنعت کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر بہترین کیرے متعارف کرائے۔ جو بہت ہائی ریزولوشن تصویر لے سکتے تھے۔ اسی طرح اسپاکی کیرے اور انڈر وائر کام کرنے والے کیرے بھی بنائے۔

1935 میں کوڈک نے جدت کی دنیا میں ایک قدم اور بڑھایا اور دنیا کا پہلا کمر تصویر اتارنے والا کیرا اور فلم رول منظر عام پر آیا۔ اسے کوڈک کروم کا نام دیا گیا اور اس وقت یہ ٹیکنالوجی کسی قدر پیچیدہ تھی اس لیے فلم رول دھلنے اور کیرے میں لوڈ ہونے کے لیے کوڈک کی فیکٹری جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم تک یہ سلسلہ جاری رہا اس کے بعد فلم کا پرویس بھی عام فوٹو شاپس پر ہونے لگا۔ دوسری جنگ عظیم نے جہاں ایک طرف امریکا کو سپر پاور بنا دیا وہیں ٹیکنالوجی کے میدان میں اس کی قیادت جو بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوئی تھی اس سے چھٹنے لگی اور دوسرے ممالک اب جدت سازی میں آگے نظر آنے لگے۔

خاص طور سے جاپان جسے امریکی فوج نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اسی بربادی کی راکھ سے ایک نئے جاپان نے جنم لیا۔ اس نے سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں اپنے قاتل کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ چند سالوں میں دنیا بھر میں سستے جاپانی کیرے اور فلم رول گردش کرنے لگے۔ جاپانی کیرے

کرنے والے ہر شخص کی پہنچ میں ہے۔ میگا بائٹ کی یو ایس بی تو اتنی عام ہو گئی ہے کہ بچہ بچہ لیے گھومتا ہے۔ امید ہے چند سال بعد سائلڈ سکرٹ میموری ہارڈ ڈرائیو کو اسی طرح ختم کر دے گی جیسے ہارڈ ڈرائیو نے بھی متناسطی شپ کو ختم کیا تھا۔ ان ایجادات نے ڈیجیٹل کیمرے اور ڈیجیٹل فوٹو گرافی کی راہ ہموار کر دی۔ آج ڈیجیٹل کیمرے بنانے والی کمپنیوں کی تعداد ہزاروں میں جا چکی ہے۔ ہر روز درجنوں کے حساب سے نئے ماڈل سامنے آ رہے ہیں۔ لیکن اولین ڈیجیٹل کیمرے کی ایجاد کا سہرا جاپانی کمپنی کینن کے سر جاتا ہے۔ اس کا بنایا ہوا ڈیجیٹل کیمرا تجرباتی طور پر 1984 کے لاس اینجلس اولمپک میں استعمال ہوا اور اگلے روز اس کیمرے سے لی گئی تصاویر جاپان کے اخبارات میں شائع ہوئیں کیونکہ اس کیمرے کی تصاویر فون لائن کی مدد سے سیکنڈ سے بھی پہلے جاپان پہنچ دی گئی تھیں۔ ان تصاویر کا معیار اتنا شاندار تھا کہ کینن نے فوری طور پر اپنی ایجاد کو مارکیٹ میں لانے کا فیصلہ کیا۔ آج کینن ڈیجیٹل فوٹو گرافی میں لیڈر ہے۔

1988 میں دنیا کے پہلے ڈیجیٹل اسکینر کی ایجاد سے یہ ممکن ہو گیا کہ اب کسی بھی فلم یا تصویر کو اسکین کر کے ڈیجیٹل صورت میں محفوظ کر لیا جائے۔ اس ایجاد نے قدیم ترین تصاویر اور فلموں کو محفوظ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ فلم رول یا کاغذ پر چھپی تصویر کی ایک زندگی ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر ڈیجیٹل صورت میں آنے کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے ہیں۔ آج سے ہزار سال دس ہزار سال بعد بھی ان چیزوں کو دیکھا جاسکے گا۔ نوے کا عشرہ ڈیجیٹل فوٹو گرافی کے لیے موسم بہار لے کر آیا۔ متعدد کمپنیوں نے سستے، استعمال میں آسان اور اعلیٰ درجے کی تصویر بچھنے والے ڈیجیٹل کیمرے متعارف کرائے اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے عوام میں مقبول ہوتے گئے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں نئے معلومات ذخیرہ کرنے والے آلات سامنے آئے۔ ان کی مدد سے ڈیجیٹل فوٹو گرافی مزید آسان ہو گئی۔ کمپیوٹر مانیٹر، لیپ ٹاپ، شیب اور اسمارٹ موبائل فون کی آمد سے تصویروں کو پرنٹ کرنے کے جھنجھٹ سے بھی نجات مل گئی۔ اب اپنی تصاویر بہ آسانی ان چیزوں کی اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں اور اپنی مرضی کا سائز اور انداز کر کے۔

☆☆☆

بھی تھا کیونکہ اس کا خام مال چاول سے حاصل کیا جاتا تھا اور چاول دنیا میں سب سے زیادہ اگنے والی فصل ہے۔ حیرت انگیز طور پر فلم رول تقریباً سوا صدی تک عکس بندی کی دنیا پر راج کرتا رہا۔ بلکہ بہت ساری صورتوں میں اب بھی کر رہا ہے۔ بے شک ڈیجیٹل کیمروں نے اب اس کی جگہ لے لی ہے۔ عام تصویر لینی ہو یا کوئی ملٹی میڈیا ڈائریکٹری مودی بنانی ہو ہر دو جگہ ڈیجیٹل کیمرے ہی استعمال ہو رہے ہیں۔ فلم رول کا استعمال تقریباً متروک ہو گیا ہے بلکہ سینما میں ریلیز کے لیے فلم رول بھی ڈیجیٹل مودی سے تیار کیا جاتا ہے۔ کچھ سال بعد سینما بھی ڈیجیٹل ہو جائیں گے تب رول فلم کا استعمال بالکل متروک ہو جائے گا۔ ابھی بھی کچھ شعبوں میں اس سے کام لیا جا رہا ہے۔

عکس کو ڈیجیٹل شکل کی صورت میں بچھنے کا آغاز ناسا کے ایک پروجیکٹ سے ہوا۔ ناسا ایک خلائی گاڑی جسے پروب بھی کہتے ہیں چاند پر بھیج رہا تھا۔ گاڑی کی روانگی کے بعد یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ایسا لوگ شکل صحیح کام نہیں کر رہے تھے، تصویر خراب آرہی تھی اور آوازوں میں شور بہت تھا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے شکل کو کمپیوٹر سے گزار کر بھیجا گیا اس کا نتیجہ حیرت انگیز نکلا۔ چاند سے آنے والے شکل ایک دم صاف ہو گئے۔ تصویریں نمایاں ہو گئیں اور آوازوں میں شور غائب ہو گیا۔ یہ ڈیجیٹل شکل کا آغاز تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے متعدد نئی ایجادات سامنے آئی تھیں جیسے میزائل یا راکٹ ٹیکنالوجی اور جیٹ انجن وغیرہ۔ اسی طرح سرد جنگ کے دوران بھی بہت ساری ٹیکنالوجیز پر کام ہوا۔ ان میں ایک معلومات کو محفوظ کرنے کا ڈیجیٹل طریقہ بھی تھا۔ مگر اسے منظر عام پر آنے اور عام زندگی میں اپنی جگہ بنانے میں بہت طویل عرصہ لگا تھا۔ متناسطی ایسا لوگ شکل نصف صدی تک دنیا پر حکومت کرتا رہا جس کی نشانی متناسطی شپ تھی۔ اب ڈیجیٹل اسٹوریج کا دور ہے۔

نوے کے عشرے میں سی ڈی کی آمد نے ڈیجیٹل ریکارڈنگ کی راہ ہموار کر دی۔ معلومات چاہے وہ ٹیکسٹ ہوں، تصاویر ہوں یا مودی کی صورت میں ہوں، ایک سی ڈی پر محفوظ ہونے لگیں۔ سی ڈی ڈرائیو کی لیزر سی ڈی پر معلومات لکھتی بھی ہے اور پڑھ بھی لیتی ہے۔ شروع میں اس کی گنجائش محدود تھی لیکن پھر ڈی ڈی اور اب سولڈ سکرٹ میموری نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ ہیکل کے برابر یو ایس بی ہارڈ ڈسک میرا بائٹ ڈیٹا محفوظ کرتی ہے اور یہ کمپیوٹر استعمال

جس وقت لوئیس اور ولیم عکس کو کسی سطح پر منتقل کرنے کی جگہ دو میں لگے ہوئے تھے اس وقت کچھ لوگ اس سے بھی آگے کی سوچ رہے تھے۔ وہ صرف سادہ تصویر کو محفوظ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ متحرک منظر کو محفوظ کرنا اور پھر اسے چلا کر دکھانا چاہتے تھے۔ دنیا میں جس شخص نے سب سے پہلے آئینہ کے عمل کی وضاحت کی وہ مصر کا مسلم سائنس دان البتیم تھا۔ اس نے روشنی، بصارت اور آئینوں پر نہایت جامع کتاب لکھی۔ اس میں اس نے وضاحت کی کہ انسان کی آنکھ روشنی کی مدد سے دیکھتی ہے۔ جب روشنی کسی چیز سے ٹکرا کر آنکھ میں داخل ہوتی ہے تو پردہ ٹکلیہ پر اس منظر کی تصویر کچھ دیر کے لیے جم جاتی ہے۔ جب یہ تصویر ہٹتی ہے تو اس کی جگہ دوسری تصویر بنتی ہے اور ان مسلسل تصویروں سے ہمیں لگتا ہے کہ منظر جاری ہے۔ البتیم نے ایک پن ہول کیمرا بھی ایجاد کیا تھا جو کسی منظر کو ایک پردے پر دکھا سکتا تھا۔ یہ شرطیکہ منظر اس کیمرے کے لینس کے سامنے ہو۔ اسے آپ اس دور کا سادہ لی وی بھی کہہ سکتے ہیں۔ افسوس کہ اس عظیم سائنس دان سے مسلم دنیا نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

بعد میں ایک پرتگالی ٹیم ہڈا ڈیلا پورٹو نے ابن البتیم کے پن ہول کیمرے کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک پروجیکٹر ایجاد کیا۔ اس پروجیکٹر میں ایک باریک سوراخ کے سامنے ایک طاقتور عدسہ لگا تھا۔ جب روشنی کوئی منظر لیے اس سوراخ سے داخل ہو کر عدسے سے گزرتی تو سامنے پردے پر اس منظر کو من و عن پیش کر دیتی تھی۔ منظر کی کوالٹی کا انحصار اس بات پر ہوتا تھا کہ جو منظر دکھایا جا رہا تھا اس پر کتنی تیز روشنی تھی اور لینس کتنا طاقتور تھا۔ لینس سے گزرنے سے پہلے روشنی کو ایک آئینے سے منعکس کیا جاتا یوں شبیہ الٹی ہو جاتی اور لینس سے گزرتے ہوئے یہ ایک بار پھر الٹی یعنی حقیقت میں سیدھی ہو جاتی۔ یوں پردے پر ایک حقیقی منظر کی مودی چلے لگتی۔ مگر اس وقت منظر کو محفوظ کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے مودی بس ایک ہی بار چلتی تھی۔

درحقیقت متحرک تصاویر کو پیش کرنے کا سلسلہ ساکت عکس کو محفوظ کرنے کی کوششوں سے خاصا پہلے شروع ہو گیا تھا۔ سولہویں صدی کے دوران ڈیوڈ ایم ٹی شخص نے سینما کا تصور پیش کیا۔ یہی نہیں اس نے پن ہول کیمرے کے مناظر میں شیشے پر لکھے الفاظ شامل کر کے ایک طرح سے فلم کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ واضح رہے کہ آغاز میں فلم خاموش ہوتی تھی

اور اسکرین پر سب ٹائٹل لکھے ہوئے آتے تھے۔ مگر یہ سب چیزیں یوں ناکام رہیں کہ یہ کسی منظر کو ہی پروبے پر پیش کر رہی ہوتی تھیں تو لوگ پردے کے بجائے اصلی منظر کیوں نہ دیکھ لیتے۔ اس دوران میں سائنس دان اسٹیمفر ٹائی شخص نے ایک انوکھی چیز پیش کی۔ اس نے ایک گول ڈرم پر ایسی تصاویر لگائیں جو ایک منظر کی یکے بعد دیگرے کی عکس تھیں۔ یہ سب ہاتھ سے بنے اچھے تھے۔ اس وقت تک فوٹو گرافی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جب ڈرم کو گھمایا تو ایسا لگا جیسے منظر حرکت میں آ گیا ہو۔ پھر اس نے ایسے ہی متعدد مناظر گھومنے والی ڈسک پر بنا کر لوگوں کو دکھائے۔ یہ مودی کا آغاز تھا۔ درحقیقت سائنس نے لوگوں کو بتایا کہ مودی ایک ہی منظر کی مسلسل تصویروں کا نام ہے۔ بد قسمتی سے آج دنیا اس شخص کے بارے میں بہت کم جانتی ہے۔

جون 1872 کے تاریخی دن دنیا کی پہلی مودی شوٹ کی گئی۔ فوٹو گرافر ایڈورڈ سبرج نے لیلیڈا اسٹین فوڈ کی سرپرستی میں ایک دوڑتے گھوڑے سیلی گارڈنر کی مختصر سی فلم بنائی۔ یہ محفوظ کی جانے والی اولین مودی تھی۔ اس وقت کوئی ایسا کیمرا نہیں تھا جو اس منظر کو ریکارڈ کر سکتا اس لیے منظر کو ریکارڈ کرنے کے لیے چوبیس ساکت کیمرے ایک قطار میں رکھے گئے اور ان سے یکے بعد دیگرے دوڑتے گھوڑے کی تصاویر لی گئیں اور جب انہیں تیز رفتاری سے پروجیکٹر کی مدد سے دکھایا گیا تو ایسا لگا جیسے گھوڑا دوڑ رہا ہے۔ یہ سین پریس کی موجودگی میں کیلی فورنیا کے ایک فارم میں فلم بند کیا گیا تھا اور اس کے لیے نہایت اونوکھا طریقہ اختیار کیا گیا۔ تصویروں کو بالکل درست انداز میں یکے بعد دیگرے اتارنے کے لیے کیمروں کے بٹن ڈوریوں سے منسلک کر کے انہیں اس راستے پر تان دیا گیا جس سے گھوڑے کو دوڑتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس کے اگلے پھر جس کیمرے کی ڈوری سے ٹکراتے وہ اس کی تصویر لے لیتا اور یوں گھوڑے نے خود ہی اپنے دوڑنے کے منظر کو درست انداز میں ریکارڈ کرنے میں مدد کی۔

اس کے چند سال بعد ایٹینے جولییس میری نے ایک شوٹنگ گن ایجاد کی۔ یہ گن ایک سیکنڈ میں بارہ تصویریں لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ایٹینے ماہر حیاتیات تھا اور وہ اس گن کو انسانوں اور جانوروں کی حرکات کا مشاہدہ کرنے میں استعمال کرتا تھا۔ ہم اسے دنیا کا پہلا مودی کیمرا بھی قرار دے سکتے ہیں۔ ایٹینے نے اس کا نام کروٹو فوٹو گرافک گن

رکھا تھا۔ لیکن اس نے کبھی اسے فلم بنانے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ محرک فلم بنانے کا دوسرا تجربہ انگلینڈ کی کاؤنٹی یارک شائر کے علاقے لیڈز کے قصبے راؤنڈریز میں کیا گیا۔ اس فلم کا نام راؤنڈریز گارڈن سین تھا اور اسے اکتوبر 1888 میں لوئیس لی پرئس نامی شخص نے بنایا تھا۔ یہ پہلی مودی ہے جو آج بھی محفوظ ہے۔

مودی کیرا بنانے میں ایک اہم پیش رفت ولیم فریس گرین نامی شخص نے 1890 میں کی۔ یہ برطانوی ایک ایسا کیرا ایجاد کرنے میں کامیاب رہا جو کولائڈ فلم کو استعمال کرتے ہوئے ایک سینکڑ میں دس تصویریں لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کیرے کے بارے میں ایک مضمون برٹش فوٹو گرافک نیوز میں شائع ہوا۔ گرین نے اس مضمون کی ایک کاپی امریکی موجد تھامس ایڈیسن کو بھیجی اور اس نے اپنی تجربہ گاہ میں اس تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے ایک مودی کیرا بنایا۔ جسے اس نے کینیڈا اسکوپ کا نام دیا تھا۔ مگر ایڈیسن خود اس سے زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ بعد میں اس کے بارے میں سائنس امریکا نامی رسالے میں بھی چھپا اور اگلے سال اپریل میں ولیم نے اپنی ایجاد کا عوامی مظاہرہ کیا۔ لیکن کم رفتار اور کم معیار کی وجہ سے یہ لوگوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔

ایڈیسن، ایڈورڈ اور ولیم جیسے لوگوں کی کاوشوں سے تحقیق دان اس طرف متوجہ ہوئے اور اس بات پر یقین کیا جانے لگا کہ جلد ایک مودی کیرا جیسا کہ آج ہم استعمال کرتے ہیں معرض وجود میں آجائے گا۔ بے شمار لوگوں نے اس سلسلے میں کوششیں کیں لیکن کامیابی ڈیو ایلی کے ڈکسن کے حصے میں آئی جو تھامس ایڈیسن کا ایک شاگرد اور اس کی تجربہ گاہ میں کام کرتا تھا۔ اس نے دنیا کا پہلا مکمل اور کامیاب مودی کیرا ایجاد کیا۔ اس ایجاد کا نام کینیڈو گراف رکھا گیا تھا۔ 1891 میں یہ ایجاد پٹنٹ ہوئی اور اس کے فوراً کوڈک کی شاپس کے باہر لوگوں کا جھوم نظر آنے لگا جو اس کیرے میں لگنے والے پینتیس ایم ایم کا فلم رول خریدنا چاہتے تھے۔ یہاں بھی کوڈک بازی لے گئی۔ اس نے پہلے ہی مودی کیرے کے لیے فلم رول تیار کر لیا تھا۔ مگر پینتیس ایم ایم کا یہ رول ایڈیسن کی ایجاد تھا جو کوڈک نے خرید لیا اور اب وہی اسے بنا رہی تھی۔

اس ایجاد میں ایک خالی تھی۔ فلم بننے کے بعد اسے ایک وقت میں صرف ایک آدمی دیکھ سکتا تھا اور وہ بھی ایک

چھوٹے سے سوراخ میں سے جھانک کر۔ کیونکہ اس وقت تک نہ تو فلم پروجیکٹر وجود میں آیا تھا اور نہ ہی سینما بنے تھے۔ یہ چھوٹا بکس نما آلہ جس میں آدمی کبڑا ہو کر مودی دیکھتا تھا ایڈیسن کی ایجاد کینیڈو اسکوپ کے نام سے پکارا گیا۔ حالانکہ یہ ایڈیسن کی ایجاد سے مختلف تھا اور اسے بھی ڈکسن نے بنایا تھا۔ بالآخر ایک فرانسیسی چارلس فرانسس جینکیر نے دنیا کا پہلا عملی فلم پروجیکٹر ایجاد کیا اور اسے کینیڈو اسکوپ کا نام دیا گیا۔ 1895 میں پیرس میں اس کا پہلا مظاہرہ ہوا۔ سینما میں ایک ٹرین کے آنے کا منظر اسکرین پر پیش کیا گیا اور اس وقت لوگوں کے لیے یہ اتنی انوکھی شے تھی کہ وہ ٹرین کی آمد کو سچ سمجھتے اور سینما میں اپنی بیٹیاں چھوڑ کر بھاگ نکلتے۔

اس وقت تک کئی اور لوگوں نے بھی فلم پروجیکٹر بنا لیے تھے۔ اس میں سب نے اپنے اپنے تجربات کیے تھے۔ بعض نے تیز رفتار پروجیکٹر بنائے تھے اور بعض مختلف سائز کا فلم رول استعمال کرتے تھے۔ لیکن بالآخر ایڈیسن کا بنایا پینتیس ایم ایم کا فلم رول اور ایک سینکڑ میں سولہ تصاویر کا پروجیکٹر اسپڈ معیار بن گیا۔ آنے والی ایک صدی تک سینما اسی معیار پر شائقین کو فلم دکھاتے رہے اور اس میں بہت کم ہی تبدیلی آئی تھی۔ 1893 میں شکاگو میں ورلڈ کولمبیا ایکسپو ڈیشن نامی ٹھیسر میں جانوروں کی حرکات پر پیکچر کی ایک سیریز کا اہتمام ہوا جس میں لوگوں کو پروے پر جانوروں کی فلمیں بنا کر دکھائی جاتی تھیں۔ یہ سائنسی پیکچر تھا لیکن عام لوگوں نے بھی اس میں بہت دل چسپی لی اور جتنے ٹکٹ خرید کر اسے دیکھنے آتے تھے۔ یہ کمرشل سینما کا آغاز تھا۔ بعد میں اس ٹھیسر کو مستقل سینما گھر میں بدل دیا گیا اور یہاں باقاعدگی سے فلموں کی نمائش ہونے لگی تھی۔

فلم سازی میں ایک رکاوٹ ابھی بھی موجود تھی اور وہ فلم رول کی طوالت تھی۔ اس وقت فلم رول بہت چھوٹے ہوتے تھے اور ان پر مشکل سے ایک دو منٹ کی مودی بن پاتی تھی۔ اس مشکل کو فلم پروجیکٹر کے خالق ڈکسن نے دور کیا۔ وہ اس وقت ایڈیسن کی لیب میں بہ طور انچارج کام کر رہا تھا۔ اس نے بہت طویل فلم رول تیار کیا۔ طویل فلم رول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ رول گھومنے کی رفتار تھی جس سے حرارت پیدا ہوتی تھی اور یہ حرارت فلم رول کو ضائع کر دیتی تھی۔ ڈکسن نے کچھ نئے ٹیمپلز استعمال کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ اب طویل فلم رول بن سکتا تھا اور یہ

حرارت سے متاثر بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران ایسے کئی رول استعمال ہوتے تھے لیکن ایک ہی رول پر آرام سے گھٹنوں کی مودی بن سکتی تھی۔ جب ایک رول تیار ہو جاتا تو اس سے بیک وقت ہزاروں رول اسی معیار کے تیار کیے جاسکتے تھے۔

جس وقت امریکا میں فلم رول، کیمروں اور پروجیکٹرز پر کام جاری تھا اس وقت اوقیانوس کے دوسری طرف یورپ میں بھی اس کام کے لیے دوڑ لگی ہوئی تھی۔ 1887 میں ایک جرمن اولومر آفس شوٹز نے ایک شیشے کے ڈرم میں چوبیس تصاویر لگا کر اسے گھما کر دکھایا تو لوگوں کو تصویر حرکت کرتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے چند سال بعد فرانس میں چارلس نے دنیا کا پہلا عملی پروجیکٹر بنا کر اس کی نمائش بھی کر دی۔ یورپ اور امریکا کے سائنس دان اور باہر ایک دوسرے کی کاوشوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یورپ کو امریکا پر سائنس و ٹیکنالوجی میں برتری حاصل تھی حالانکہ اس وقت تک کئی اہم ایجادات جیسے ہوائی جہاز امریکا میں ہی ایجاد ہوئے تھے اس کے باوجود ٹھوس سائنس میں یورپ کا پلہ ہماری تھا۔

مگر پہلی اور دوسری جنگ عظیم نے یورپ کو شدید نقصان پہنچایا اور دنیا پر اس کی سیادت ختم کر دی۔ وہ سائنس دان جو یورپ کا افتخار تھے وہ امریکا چلے گئے اور اب وہاں کام کرنے لگے اس سے امریکا سائنس و ٹیکنالوجی کی دنیا کی بھی سپر پاور بن گیا۔ ان دو جنگوں اور ان کے درمیانی وقفوں میں یورپ شدید انتشار کا شکار رہا اس کے باوجود وہاں سائنسی سرگرمیاں بھی جاری رہی تھیں۔ خاص طور سے جرمنی میں بہت کام ہو رہا تھا۔ اگرچہ کیرا، فلم رول اور پروجیکٹرز کے معاملے میں جرمنوں کا کردار نہ ہونے کے برابر تھا لیکن اس کے باوجود دنیا کا پہلا معیاری اور مکمل سینما بنانے کا اعزاز جرمنوں کو حاصل ہوا۔ میکس اور ایل نامی دو افراد نے اپنا پروجیکٹر ”باوا اسکوپ“ کے نام سے ایجاد کیا اور برلن میں اولین کمرشل سینما بنایا۔ جس میں پہلی فلم کی نمائش کی گئی۔ جرمن اس معاملے میں بازی لے گئے تھے۔ یہ فلم 1 نومبر 1895 میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ بعد میں دنیا بھر میں سینما گھر اسی پروجیکٹر کی مدد سے فلمیں دکھانے لگے۔ حرے کی بات ہے اس دور میں سینما کو باوا اسکوپ ہی کہا جاتا تھا جو اس کے موجدوں کے لیے اعزاز ہے۔ طویل عرصے

تک یہی پروجیکٹر زکام کرتے رہے۔ آغاز میں فلمیں کسی ایک واقعے پر اور ایک ہی سین میں ایک ہی کیرے سے بنائی جاتی تھیں۔ اسٹوڈیوز کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ساری شوٹنگ آؤٹ ڈور ہوتی تھی۔ نہ لائٹ ہوتی تھی اور نہ ہی فلم سازی کے دوسرے آلات ہوتے تھے۔ فلم بھی مشکل سے ایک سے دو منٹ کی ہوتی تھی اور عام طور سے کسی مکمل یا چھوٹے سے واقعے کی عکاسی کرتی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک باقاعدہ فلمیں بننا شروع ہوئیں جن کی طوالت پندرہ منٹ سے آدھے گھنٹے تک ہوتی تھی۔ اس میں اینڈر شوٹنگ بھی ہوتی تھی۔ لائٹ کے ساتھ کئی کیمروں کا استعمال بھی شروع ہو گیا۔ ڈائریکشن اور ایڈیٹنگ کے شعبے وجود میں آ گئے۔ فلم سازی کے لیے نئے نئے آلات بننے لگے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو اس شعبے میں دلچسپی ہوئی تو اس کا معیار خود بہ خود بڑھنے لگا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں فلم سازی ایک باقاعدہ صنعت کی حیثیت اختیار کر گئی تھی اور فلم دیکھنا رواج ہو گیا تھا۔

یوں عکس کو ساکت حالت میں محفوظ رکھنے سے لے کر اسے متحرک حالت میں دیکھنے کا انسان کا پرانا خواب پورا ہوا۔ ساکت عکس فوٹو گراف کی صورت میں اور متحرک عکس مودی کی صورت میں سامنے آیا۔ منظر کو براہ راست کہیں دیکھنے کے ویو مالا کی خیال نے ٹی وی کی صورت اختیار کر لی۔ پہلے سینما آیا اور پھر ٹی وی ایجاد ہوا تو ایسا لگا کہ اس شعبے کی تکمیل ہو گئی ہے۔ لوگ گول ڈانما بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی دیکھ کر بھی بہت خوش ہوتے تھے۔ مگر یہ ہمیشہ کی طرح انسان کی خام خیالی تھی۔ ٹی وی آنے کے کچھ عرصے بعد ہی رنگین ٹی وی کے لیے کوشش شروع ہوئی اور بالآخر رنگین ٹی وی بھی تیار ہو کر مارکیٹ میں آ گیا۔

آنے والے تیس سال تک روایتی ٹی وی میں جدت سازی جاری رہی۔ تصویر کا معیار بہت بہتر ہوا۔ رنگوں اور آوازوں سے گھر پر رونق ہو گئے۔ تصویر بالکل اصل کا منظر پیش کرنے لگی۔ ٹی وی نے اتنی ترقی کی کہ سینما کو پیچھے چھوڑ دیا۔ وی سی آر کی آمد نے سینما کو گھر پہنچا دیا۔ جس مودی کے لیے لوگ پہلے سینما میں لگنے کا انتظار کرتے تھے اور پھر ٹکٹ خرید کر دیکھنے جاتے تھے اب وہ گھر میں کیسٹ لاکر آرام سے دیکھتے اور جس طرح سے چاہتے دیکھتے۔ اس میں سینما والی پابندی بھی نہیں تھی۔ وی سی آر کے بعد سی ڈی پلیر اور پھر ڈی وی ڈی آیا جس نے معیار کو زمین سے آسمان پر پہنچا

شہر گزشت

امین بھایالی



وقت نے کس تیزی سے کراچی کی شکل بدلی ہے کہ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے سب کچھ بدل گیا ہے۔ انسانی نفسیات، عادت و اطوار، غور و فکر کا انداز، کیا نہیں بدلا ہے۔ ماضی میں جہانگیر تو آپ کو یکسر مختلف کراچی نظر آئے گا، جب محلے کا ہر بزرگ نانا دادا، خالو چچا ہوتا تھا اور ہر بچہ ادب کرنا خود پر فرض سمجھتا تھا۔ یہ روشنیوں کا شہر تھا، دکانیں ساری ساری رات کھلی رہتی تھیں اور کوئی دھڑکا بھی نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ برابر سے ہائیک گزر جائے تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جائے۔ ہر طرف امن چین تھا، سکون تھا، اخوت و بھائی چارے کی فضا تھی۔

چند سال قبل کے کراچی کی ایک افشانی تصویر

آج بھی جب میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو میری نظروں میں گزرا وقت جاہ نظر آتا ہے خود کو ایک چھوٹا سا بچہ دیکھتا ہوں۔ جو اپنی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہہ رہا ہے ”جی وہ... وہ... وہ... وہ...“ اگلی گاڑی دو پہر بارہ بجے آئے گی۔“ ”اوہ اچھا، بس پھر تو کوئی ٹکر کی بات نہیں ابھی تو صرف دس ہی بجے ہیں۔“ تو نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اور ہاں بھی اپنی ای سے کہہ دو کہ وہ اگلے ڈیڑھ

ہوا اور ڈیجیٹل سینما آگئے۔ ان میں ٹی وی جیسی بڑی سی اسکرین ہوتی ہے جس پر مووی چلتی ہے اور معیار وہی ہے جو اعلیٰ درجے کے ایل ای ڈی ڈسپلے کا ہوتا ہے۔ جب کہ پروجیکٹر کی مدد سے دکھائی جانے والی فلم کا معیار کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں حقیقی رنگ اور تاثر نہیں آتا تھا۔ ڈیجیٹل سینما کی آمد سے قہری ڈی کا معیار بھی بڑھ گیا ہے اور اب یہ تقریباً حقیقت کے قریب جا پہنچا ہے۔ قہری ڈی مووی دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ منظر کا ایک حصہ ہے اور یہ سب اس کے آس پاس چل رہا ہے۔

ہزاروں سال پہلے انسان نے عکس دیکھا اور پھر آنے والے انسان نے اسے محفوظ کرنے کے بارے میں سوچا۔ آج انسان قہری ڈی کی حد تک پہنچا ہے لیکن یہ قہری ڈی بھی آخری حد نہیں ہے۔ اگلی منزل ہولوگراف ہے جو ہماری زندگی میں بہت سارے شعبوں میں داخل ہو چکا ہے لیکن ابھی اسے مکمل طور پر آنے میں وقت ہے۔ ہولوگراف عکس یا مووی کی ایک ایسی صورت ہے جو تین سو ساٹھ درجے کے زیادہ سے ہوتی ہے۔ اسے یوں سمجھیں کہ ایک تصویر صرف سامنے کا منظر دکھاتی ہے جتنا کمرے نے شوٹ کیا ہوتا ہے جب کہ قہری ڈی اس طرح سے دکھاتی ہے جیسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن ہولوگراف اس طرح دکھاتی ہے کہ اس میں چیز آگے پیچھے ہر طرف سے نظر آتی ہے۔ جیسے آپ ایک ہولوگراف کی صورت میں نظر آنے والے شخص کے چاروں طرف سے گھوم کر اسے دیکھنا چاہیں تو یہ ممکن ہے اس کا صرف سامنے کا رخ ہی نہیں بلکہ دائیں بائیں اور پیچھے کے رخ بھی اسی طرح دکھائی دیں گے جیسے ایک جیتے جاگتے اور آپ کے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ سکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ وہ اصل انسان یا منظر نہیں ہوگا بلکہ صرف اس کا عکس ہوگا۔

ہولوگراف کے لیے دستیاب واحد چیز لیزر ہے لیکن یہ بہت مہنگی اور مشکل چیز ہے۔ اس کے باوجود اس شعبے میں رفتہ رفتہ ترقی ہو رہی ہے۔ جلد مارکیٹ میں ایسے کمپیوٹر دستیاب ہوں گے جو مکمل طور پر ہولوگراف کی مدد سے کام کریں گے۔ ہولوگراف ٹی وی اور سینما وجود میں آئیں گے اور نہ جانے ترقی کی یہ دوڑ ہمیں کہاں تک لے جائے گی۔ ہولوگراف موبائل فون تو وجود میں آچکا ہے۔ بس دیکھیے اور اشک کرتے رہیے۔

دیا۔ فرق اتنا زیادہ تھا کہ لوگ روایتی کیسٹ بلکہ سی ڈی کو بھی بھول گئے۔ اب معیار ڈی وی ڈی ہے۔ اگرچہ یہ بھی حرف آخر نہیں ہے اس سے بھی آگے بلورے اور دوسرے درجن آچکے ہیں۔

انسان دو آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اگر کسی کی ایک آنکھ ہو یا آدی دو کے بجائے صرف ایک آنکھ سے دیکھے تو اسے دو بعدی منظر کہتے ہیں۔ یعنی دیکھنے والے کو صرف لمبائی چوڑائی کا احساس ہوگا۔ آپ چاہیں تو خود بھی یہ تجربہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ جب انسان دو آنکھوں سے دیکھتا ہے تو منظر اسے سہ بعدی نظر آتا ہے۔ اس میں لمبائی اور چوڑائی کے ساتھ گہرائی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے قہری ڈی یا سینٹیل یا قہری ڈی لٹکٹ کہتے ہیں۔ جب سادہ فوٹو گراف ایجاد ہوئے تو تصویر میں انسان سہ بعدیت پیدا کرنے سے قاصر تھا اس لیے اس نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں۔ لیکن جب مووی بنی اور انسان نے اسے دیکھا تو اس میں اسے گنجائش نظر آئی۔

مووی کو قہری ڈی کرنے کی کوششوں کا آغاز فلم سازی کے ابتدائی دور میں ہو گیا تھا اور بعض قہری ڈی موویز 1915 میں تیار ہوئی تھیں مگر یہ اپنا تاثر چھوڑنے میں ناکام رہیں۔ اس وقت ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ ایسے کمرے ایجاد کیے جاتے جو سہ بعدی مووی بنا سکتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی میں ترقی ہوتی رہی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا دور آیا تو مووی کیمروں پر بھی اس کا اثر نظر آیا تھا۔ اس وقت قہری ڈی مووی کے لیے دوبارہ کوشش کی گئی۔ 1950 میں اس سلسلے میں سنجیدہ کوششیں شروع ہوئیں۔ مگر اس وقت بھی آلات اتنے ترقی یافتہ نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے قہری ڈی کے آلات نہایت مہنگے تھے اور اس میں فلم بنانے کا مکمل نہ صرف مہنگا بلکہ سنجیدہ بھی تھا اس لیے قہری ڈی موویز بنیں لیکن اپنا اثر نہ چھوڑ سکیں۔

اس میدان میں صحیح ترقی اس وقت ہوئی جب ڈیجیٹل آلات بنے۔ اسی اور نوے کی دہائی میں ڈیجیٹل سینما معروف نام بن گیا جہاں لوگ مخصوص ٹیکسٹ پین کر قہری ڈی فلم سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اس میں لمبائی چوڑائی کے ساتھ گہرائی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس شعبے میں مزید ترقی ہوئی۔ پروجیکٹر کا دور ختم

ایک گھنٹے میں ساری تیاریاں مکمل کر لیں، تاکہ دیر نہ ہو۔“ میں جلدی سے امی کی طرف بھاگا جو کہ کمرے کے ساتھ ہی گئے باورچی خانے میں کھڑی قیہ، پیاز، ثابت خشک دھنیہ اور ہری مرچیں ملے باجرے کے آٹے کے کباب تل رہی تھیں ہاں ہاں بھئی۔۔۔۔! من لیا ہے میں نے، جاؤ اپنے اتو سے کہو کہ میں نے اپنی ساری تیاریاں کم و بیش مکمل کر لی ہیں۔ آلوؤں کا خشک سالن اور ٹیبل پوریاں کب کی تیار بھی ہو چکیں۔ اب میں تمہارے پسندیدہ کباب تل رہی ہوں اور پھر یہ سارا کچھ ٹفن کیریز میں بھرنے کے بعد چائے بنا کر تھرماس بھی بھریں گی۔“

امی کی بات سن کر میرے منہ میں ڈھیر سارا پانی بھر آیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ بس کسی طرح سے ہم سب جلد از جلد گاڑی میں سوار ہو جائیں اور پھر گاڑی چلنے کے ساتھ ہی میں ٹفن کیریز کے خانے میں لبالب بھرے کبابوں پر اپنا ہاتھ صاف کرنا شروع کر دوں۔

کوئی دو گھنٹوں کے بعد امی، اتو اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ میں کراچی پورٹ ٹرسٹ ریلوے اسٹیشن کے چھوٹے سے پلیٹ فارم کے شیڈ کے نیچے سینٹ کے بیچ پر براجمان سامنے گزرتی ریل کی پٹریوں کے دونوں اطراف نظریں دوڑا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر کچھ خاص بھیڑ نہ تھی۔ کچھ پانچ سات نفوس ہماری طرح سے ادھر ادھر بیٹھے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دو رکشیں ٹرین کی سیٹی سنائی دی اور پھر ہلکی ہلکی چھک چھک چھک کی آواز ساعتوں سے ٹکرائی۔ سیٹی اور چھک چھک کی ٹلی جلی آوازوں نے وہاں موجود لوگوں کو متحرک کر دیا اور سب اس سمت غور سے دیکھنے لگے جہاں سے یہ آوازیں آرہی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں دور سے ٹرین کا انجن سیاہ دھواں اڑاتا نظر آیا اور پھر اپنے پیچھے لگی بوگیوں کو لئے پلیٹ فارم پر آکھڑا ہوا۔

اتو نے ایک خالی سے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم سب کو اس میں سوار ہو جانے کا اشارہ کیا۔ ابھی ہم ریل گاڑی کی اس لمبی چوڑی سی بوگی میں اپنی اپنی نشستوں پر ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ٹرین کی الوادائی سیٹی سنائی دی اور پھر کچھ وقفے کے بعد ایک بار پھر سیٹی بجی اور ٹرین نے دھیرے دھیرے آگے کی جانب سرکنا شروع کر دیا۔ ٹرین اس ریلوے اسٹیشن سے باہر آئی اور پھر ویسٹ وہارف روڈ کے ریلوے چھانک سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اب اسے جی اے الائن روڈ کے پل سے گزرتے

ہوئے اپنی منزل ”وزیر سٹیشن“ اور پھر اس سے بھی مزید آگے جانا تھا۔

یہ 70ء کی دہائی کے اواخر کے سالوں کی بات ہے۔ ہم کراچی میں نواب مہابت خان کی روڈ پر واقع کے پی ٹی گراؤنڈ (موجودہ کے پی ٹی اسپورٹس کالج) کے عین سامنے کھار اور کے علاقے پنجابی کلب میں رہا کرتے تھے۔ ہمارے گھر کی بالکنی سے جہاں سامنے کے پی ٹی گراؤنڈ نظر آتا وہیں بائیں ہاتھ پر ذرا ہی دور پورٹ ٹرسٹ ہالٹ نامی ایک بہت ہی چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بھی دکھائی دیتا، جہاں سے کراچی سرکولر ریلوے کی لوکل ٹرینیں گزرا کرتی تھیں۔

کراچی سرکولر ریلوے، جو نام سے ہی ظاہر ہے کراچی کے گرد ایک دائرہ بناتی ہوئی گزرتی تھی۔ اگر آپ کسی بھی اسٹیشن سے کسی بھی طرف کو جانے والی لوکل ٹرین پر سوار ہو جائیں تو وہ ٹرین آپ کو پورے کراچی کی سیر کردانی ہوئی بالآخر ای ریلوے اسٹیشن پر واپس لے آئے گی جہاں سے آپ اس پر سوار ہوئے تھے۔

ابو مرحوم کو ٹرین اور ٹرین کا سفر بہت پسند تھا۔ اس بات کا اندازہ یوں لگائیں کہ وہ اکثر رات کے کھانے کے بعد مجھے اپنی لال رنگ کی ہینڈ آفٹنی سوئرسائیکل پر سوار کروا کر گھر سے کچھ ہی دور واقع آئی آئی چند دیگر روڈ پر حبیب بینک پلازہ کی عمارت کے عین سامنے قائم انگریزوں کے دور کے چٹانوں کے بڑے بڑے پتھر کاٹ کر بنائے گئے ریلوے پل پر لے جاتے اور پھر ہم دونوں باپ بیٹا اس پل سے کچھ ہی دور سی اسٹیشن کی تیز روشنیوں میں وہاں پر کھڑی ریل گاڑیوں اور ارد گرد کی پٹریوں پر ڈیزل اور موٹیل آئل کی تیز بول والا سیاہ دھواں اڑا کر شنگ کرتے ریلوے انجنوں کو دیر تک دیکھا کرتے۔ پتا نہیں کیوں وہ بہت جلدی اس وقت بہت اچھا لگتا تھا۔ اتنے ڈھیر سال گزرنے کے بعد بھی وہ منظر تازہ بہ تازہ سا لگتا ہے۔

اتو مجھے ریل گاڑیوں، ان کے انجنوں اور انگریز دور میں قائم کردہ ریلوے اسٹیشنوں اور نصب کردہ ریل کی پٹریوں کے بارے میں بتاتے جاتے۔ میں نے یہ ہمیشہ محسوس کیا کہ وہ اپنے اس پسندیدہ موضوع پر متواتر بے ٹکان بولتے چلے جاتے اور اگر میں بھی کوئی سوال کر لوں ”اتو یہ انجن شنگ کیوں کرتے ہیں؟“ تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک بھر پور چمک دکھائی دیتی اور ان کا چہرہ ان کے اندرونی جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا محسوس ہوتا۔ بطور خاص وہ یہ بات تو مجھے ہر بار اور بار بار

بتایا کرتے کہ ان کے بچپن میں جب وہ ٹرین میں سفر کیا کرتے تو سب بچے ل کر ٹرین کی چھک چھک چھک کی تان پر کچھ یوں گایا کرتے:

چپل پور کے چھ چھ پیے

چپل پور کے چھ چھ پیے

چپل پور کے چھ چھ پیے

اکثر چھٹی والے دن جو اگر کہیں اور جانے کا موڈ نہ ہو رہا ہو تو پھر وہ مجھے صبح ہی صبح گھر کے سامنے والے پورٹ ٹرسٹ ہالٹ کے اسٹیشن دوڑا دیا کرتے کہ جاؤ اور ٹکٹ گھر سے معلوم کر کے آؤ کہ اگلی گاڑی کتنے بجے آئے گی اور آخری اسٹیشن کے ٹکٹ بھی خرید لینا۔ چونکہ خود مجھے بھی ان کی طرح سے ٹرین اور ٹرین کے سفر سے بھرپور لگاؤ تھا، لہذا میں دوڑتا ہوا جاتا، دوڑتا ہوا آتا اور اپنے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں انہیں اگلی گاڑی کے آنے کے وقت سے آگاہ کرتا۔

ای، ایو کا پروگرام سنتے ہی کھانے پینے کے لیے اتنا کچھ بنا لیتیں کہ ہمیں اس سارے سفر کے دوران باہر سے کچھ بھی لے کر کھانے کی ضرورت تک محسوس نہ ہوتی۔ ہم پورٹ ٹرسٹ ہالٹ کے اسٹیشن سے ریل گاڑی میں سوار ہوتے جو کراچی کے گرد دائرے میں سفر کرتی ہوئی پانچ چھ یا اس سے بھی کچھ زائد گھنٹوں میں ہمیں واپس لے آئی کہ جہاں سے ہم سب اس پر سوار ہوئے تھے۔ مزے کی بات تو یہ بھی کہ اس سارے سفر کے دوران اتو کتاب پڑھتے رہتے اور گاہے بگاہے اپنی نظریں کتاب سے اٹھا کر ریل گاڑی کی کھڑکی کے باہر تیزی سے دوڑتے ہوئے مناظر پر ڈالتے جاتے۔ گو کہ میں بھی گھر سے اپنے ہمراہ دو تین من پسند کتابیں لے کر چلتا اور اتو کی تقلید میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹرین کی کھلی کھڑکی سے دوڑتے بھاگتے نظاروں کو وقفے وقفے سے دیکھتا جاتا لیکن پھر جلد ہی اکتا کر کتاب بند کر دیتا اور پوری یکسوئی کے ساتھ لوہے کی دو عمودی سلاخیں لگی بڑی سی کھلی کھڑکی پر اپنی تھوڑی ٹاکرا باہر نظر آنے والے مناظر کو بڑی ہی محویت کے ساتھ نکتے لگتا۔

ہوتا کچھ یوں تھا کہ ہم جیسے ہی اپنے مقامی اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوتے تو آٹے سامنے نصب دو سیٹوں پر سب لوگ براجمان ہو جاتے۔ شاید بہت سے پڑھنے والوں کو یاد ہو کہ اس دور میں کراچی کی لوکل ریل گاڑیوں میں لکڑی کی بیٹوں سے بنے بیچ نصب ہوا کرتے تھے جس

میں ایک لکڑی کی پٹی کے بعد اتنی ہی جگہ خالی ہوا کرتی اور پھر خالی جگہ کے بعد لکڑی کی دوسری پٹی نصب ہوتی۔ جبکہ چند بوگیوں میں آٹے سامنے کشن والے سیاہ ریگزن سے آراستہ آرام دہ صوفے نما سیٹیں بھی ہوا کرتیں۔ ہم کوشش کر کے کوئی ایسی ہی بوگی تلاش کرتے اور پھر جیسے ہی ریل گاڑی چلتی تو امی گھر سے لایا ہوا اپنا عمر و عیار کی زینیل جیسا اسٹین لیس اسٹیل کا بڑا سا ٹفن کیریز کھوتیں اور پھر اس میں سے برآمد ہونے والی سوغاتیہں ہم دوران سفر مسلسل تھرماس میں بھری چائے کے ہمراہ نوش جان کرتے جاتے اور امی کے ہاتھ کے ڈالتے، ریل کے دلفریب و مسکور کن سفر اور شہر کراچی کے مضافاتی علاقوں کے حسین مناظر کی شان میں قصیدے پڑھتے جاتے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ہماری طرح کا کوئی خاندان جو کہ چھٹی والے دن کا لطف اٹھانے کی غرض سے ریل گاڑی کے اس ”ٹوروی کراچی“ میں ہمارا بوگی ٹفن ہوتا اور دیکھتے ہی دیکھتے جو معاملہ بچوں کے باہمی کھیل کود سے شروع ہوتا وہ خواتین کی باہمی گفتگو اور پھر مرد حضرات کی باہمی دلچسپی کے امور پر اظہار خیال سے ہوتا ہوا تبادلہ اشیاء خور و نوش تک جا پہنچتا اور پھر سب آپس میں یوں سیر و شکر ہو رہے ہوتے جیسے ان خاندانوں کے مابین ہونے والی آج یہ کوئی اتفاقی ملاقات نہ ہو بلکہ برسوں کا دوستانہ رہا ہو۔

کیا بتاؤں صاحب۔۔۔! کیا دلکش منظر ہوتا تھا۔۔۔! ریل گاڑی چھک چھک چھک کرتی بقول اتو ”چپل پور کے چھ چھ پیے“ کے مدھم گیت کی تانیں اڑاتی ہوئی اپنی ٹلی رفتار سے چلی جاتی ہوتی۔ کھڑکیوں سے آتے بھیگی نم آلود ٹھنڈی ہواؤں کے دبیز جھونکے بوگی میں سوار افراد کے بالوں کو رقصاں رکھتے۔ ہم بچے بالے یا تو سیٹوں پر بیٹھے ”اکڑ بکو پیسے بو“ لوڈو، تاش یا ”کوا اڑا۔“ بمینس اڑی“ جیسے کھیلوں میں مگن ہیں۔ خواتین باہم گھریلو امور خانہ داری نوعیت کی گفتگو میں مشغول ہیں۔ مرد حضرات میں موسیقی تفسیرات، ملکی سیاست، زیر نمائش فلموں اور ان میں کام کرتے فنکاروں کے ماضی کی یادگار فلموں اور ان کے شہکار گیتوں پر بھرپور بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ بوگی کے کسی کونے پر لگی نشست پر بیٹھے چند منہ چلے ٹرانزسٹر ریڈیو پر ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہونے والے فلمی گیتوں سے دل پشوری کر رہے ہیں اور بوگی کی فضا میں مہدی حسن مرحوم کی مدھر آواز گونج رہی ہے:-

کیوں ہم سے خفا ہو گئے اے جانِ حتما

بچتے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے
ملکی سیاسی صورتحال پر ہونے والی ان بحثوں میں
ابو اکثر اپنے مخالفین جو کہ ذرا سا بھی پاکستان یا پھر قیام
پاکستان کی مخالفت میں کوئی بلی پھلکی سی بھی اختلافی بات کرتا
یہ کہہ کر ہمیشہ ہی لاجواب کر دیا کرتے۔ ”ارے صاحب،
ہیں آپ دیکھتے جائیں، ماشاء اللہ اس وقت بھی پاکستان
اپنے تمام ہمسایہ ممالک کے مقابلے میں خوشحال اور ترقی
یافتہ ہے۔ آنے والے وقتوں میں پاکستان مزید آگے
جائے گا، حالات موجودہ صورتحال سے کہیں اور زیادہ بہتر
ہوں گے اور انشاء اللہ ہم بہت ترقی کر سکیں گے۔“

گوکہ ابو کی پیدائش 1942ء میں بھارتی ریاست
گجرات کے شہر بھاڈنگر میں ہوئی تھی اور پھر وہ چھوٹی عمر میں
اپنے والدین اور دیگر بہن بھائیوں کے ہمراہ ہجرت کر کے
اولئین شکار پور، سندھ چلے آئے اور بعد ازاں وہاں سے
کراچی کا رخ کیا۔ اپنی جنم بھوی ہونے کے اعتبار سے وہ
اپنی جائے پیدائش کو اکثر یاد کرتے لیکن انہیں بطور خاص
کراچی سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ اس کے گوشے گوشے سے
واقف تھے۔

بہر کیف، گاڑی جب کسی اسٹیشن پر رکتی تو وہاں
موجود کنسٹیشن اسٹینڈس پر زور زور سے بچتے فلمی نعمات کی
گوچ ٹرین کی کھڑکیوں سے بھی تیز اور بھی مدغم ہوتی اندر
داخل ہوتی۔ گلوکارائے نیر کا ایک گیت مجھے آج بھی یاد ہے
جو میں نے پہلی بار ٹرین کی کھڑکی میں بیٹھ کر سنا، جو کسی
ریلوے اسٹیشن پر قائم چائے کے کھوکھے پر رکھے ٹرانزسٹر
ریڈیو پر بج رہا تھا۔

لے دو ساتھی، کھلیں دو کلیاں
دیوانہ دل ہے، دیوانہ موسم
گاڑی کے رکتے ہی ان گیتوں کے ساتھ در آنے
والی دیگر آوازیں کچھ یوں ہوا کرتی تھیں۔

”چائے والا، چائے والا، چائے والا، بج کر اری
ہور ہی ہے۔ گرما گرم سموے، آلو کے گرما گرم سموے لے
لو بھائی! امرود لے لو، لیر کا، لاڑکانہ کا، امرود لے لو بھئی منجن،
پلٹے، دیکھتے، پیلے اور پاپور یا والے دانتوں کا اکسیر علاج،
کلمنی کی مشہوری کے لیے صرف اس ٹرین میں رعایتی قیمت
پر دستیاب ہے، ایک روپیہ، ایک روپیہ، ایک روپیہ، آواز
دیکر طلب کریں۔“

چلیں دوستوں، تو پھر ہم سب اپنا ریل گاڑی کا سفر
وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا۔

ہماری ریل گاڑی چھک چھک چھک کرتی، سٹی بھا
بجا کر گاڑھا سیاہ دھواں اڑاتی پورٹ ٹرسٹ ہاٹ کے
چھوٹے سے اسٹیشن کو دور پیچھے چھوڑتی ہوئی سائٹ اور ماری
پور روڈ کو جانے والے جی اے الائن روڈ کے پل کے نیچے
سے گزرتی ہوئی ماری پور روڈ کے متوازی چلتے ہوئے وزیر
منیشن ریلوے اسٹیشن کی طرف رواں دواں ہے۔ کچھ دیر
وہاں سستانے اور چند ایک مسافروں کو اتارنے اور سوار
کرنے کے بعد ریل گاڑی دوبارہ حرکت میں آتی ہے اور
دائیں ہاتھ پر متوازی چلتے ماری پور روڈ کی دوسری طرف
قائم لیاری اسپورٹس گراؤنڈ (موجودہ پیپلز اسپورٹس
کامپلیکس)، ماری پور ٹرک اسٹینڈ اور کراؤن سنیا کو پیچھے
چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ بچپن ہی سے چونکہ مجھے
فلموں سے کچھ خاص لگاؤ رہا، لہذا میری پوری کوشش ہوتی
کہ میں دیکھ سکوں کہ وہاں اس وقت کس فلم کے پبلسٹی ہو
آویزاں ہیں۔ کچھ دیر چلتے کے بعد غلامان عباس اسکول کو
پیچھے چھوڑتی ہوئی ریل گاڑی لیاری ندی پر بنے ہوئے
ریلوے کے پل پر آ پہنچتی ہے۔ اس پل کے نیچے سے
لیاری ندی کا بدبودار پانی گزرتا ہوا بائیں جانب کچھ ہی
آگے بحیرہ عرب کے سمندر میں جا گرتا ہے۔

مذکورہ مقام میرے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث ہوتا
اور میں بڑی مستعدی کے ساتھ سائٹ ایریا کی جانب
بڑھتی ریل گاڑی کے بائیں جانب کی کسی نشست پر کھڑکی
سے لگ کر بیٹھ جاتا اور بڑی ہی تجویز کے ساتھ لیاری ندی
کو دور بحیرہ عرب کے نمکین پانیوں میں مدغم ہوتے دیکھتا۔
ریلوے پل کے عین نیچے لیاری ندی کے گندے بدبودار
پانیوں میں قریبی باڑوں کی انگنت بھیڑیں غسل صحت لے
رہی ہوتیں۔ ان بھینٹوں کو لیاری ندی کے بدبودار اور
گندے پانیوں میں یوں نہاتے دیکھ کر ہمیشہ مجھے خیال آتا
کہ اکی ہرج تاجیک کے ساتھ جو خالص صحت افزا اور قوت
بخش دودھ ہم دونوں بھائیوں کو پلاتی ہیں اس کا منبع حفاظت
صحت کے تمام تر ملکی وغیر ملکی اصولوں پر پلٹی یہی بھیڑیں
ہیں۔

ابو بتایا کرتے تھے کہ ایک دور میں یہی لیاری ندی
اور اس کا پانی اس قدر صاف ستھرا ہوا کرتا تھا کہ وہ اپنے
دوستوں کے ہمراہ یہاں نہانے آیا کرتے۔ پھر لوگوں نے
اپنے سیوریج کے سارے نالوں کا رخ لیاری ندی کی طرف
کر کے بحیرہ عرب کے پانیوں اور اس میں بسی مخلوق کو بھی
آلودہ کر دیا۔

ریل گاڑی لیاری کے علاقے کو پیچھے چھوڑتے
ہوئے سائٹ ایریا میں قائم بلدیہ ریلوے اسٹیشن آ پہنچی
ہے اور کچھ دیر وہاں رک کر آگے بڑھتی ہے۔ یہاں سے
ریلوے لائن دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ سیدھی لائن
ماری پور روڈ کے متوازی چلتی ہوئی وہاں قائم سمندری نمک
کے کارخانوں اور پھر اس سے بھی آگے تک جاتی ہے لیکن وہ
ٹرک صرف مال گاڑیوں ہی کے لیے مخصوص ہے۔ جبکہ
کراچی سرکولر ریلوے کا ٹریک ماری پور والے ٹریک سے
جدا ہو کر دائیں طرف کے موڑ سے جو کہ سائٹ روڈ کہلاتا تھا
اور اب غالباً وہاں ناردرن بائی پاس قائم ہو چکا ہے، سائٹ
ایریا میں داخل ہو جاتا ہے۔

سائٹ ایریا میں داخل ہونے کے ساتھ ہی مجھے
ہیش ایک فیکٹری کی چھت پر نصب ایک بہت بڑا
”ہونہار پیل، سوڈرائنڈ بے بی فیڈر“ کا اشتہاری پورڈ نظر
آتا جس میں مخصوص انداز میں شیشے کی بنی ہوئی دودھ کی
بوتل دکھائی گئی ہوتی۔ اس کے علاوہ اب جب میں طاق
نسیاں میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو مجھے ”ایکسا ہڈ
نیٹری“ اور سب سے بڑھکر ایک مخصوص یو جو کہ گوار بھلی
سے بنائے جانے والے گوند کے کارخانے سے پھوٹا
کرتی تھی، خوب یاد آتی ہے۔

سائٹ ایریا کی ایک اور سوغات ریلوے ٹریک کے
دونوں اطراف قائم فیکٹریوں کی دیواروں پر لکھے کوچنگ
سینٹروں، حکیموں، نجومیوں، سنیا یا باداؤں، منجنوں، ہر
بیماری کی واحد داؤوں، مقامی سنیاؤں میں نمائش پذیر
فلموں کے اشتہارات، شہر بھر کی طلباء تنظیموں اور صنعتی علاقہ
ہونے کے سبب مزدور یونینوں کے ہتھوڑے اور درانتی سے
مزین پیغامات کی بھرمار ہوا کرتی اور مجھے وہ سب دیواری
اشتہارات بڑھنا بہت ہی اچھا لگتا۔ جبکہ ”اے ون کوچنگ
سینٹر“، ”پیشہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن“، ”جمیعت طلبہ
اسلام“ اور چند اور مزدور تنظیموں وغیرہ کے وہ دیواری
اشتہارات میں بڑے ہی غور سے پڑھا کرتا۔ ویسے یہ
دیواری اشتہارات تو سارے کے سارے ریلوے ٹریک
پر ہی میری تفریح طبع کا سامان بنے رہتے۔

سائٹ ایریا سے گزرتے ٹریک کے دونوں اطراف
قائم کارخانوں میں بڑی بڑی مشینیں اور کرنس وغیرہ یوں
ساکت کھڑیں نظر آتیں کہ جیسے وہ کبھی چلیں ہی نہ ہوں اور
ان تمام فیکٹریوں میں کچھ یوں ہو کا سا عالم ہوتا کہ جیسے کسی
جادوگر نے اپنی جادو کی چھڑی گھما کر انہیں ہمیشہ کے

لیے پتھر کا کر دیا ہو۔
گاڑی شیر شاہ پل کے نیچے سے گزرتی ہوئی شاہ
عبدلطیف اسٹیشن کے بعد امریلی اسٹیشن فیکٹری کے عقب
سے ہوتی ہوئی سائٹ ریلوے اسٹیشن پر قیام کے بعد پیپی
فیکٹری، منگھو پور روڈ، ہینو پاک موٹرز کی فیکٹری کے عقب
سے گزرتی ہوئی سنگھو پور اور حبیب بینک کے اسٹیشنوں پر رک
کر اورنگی نالے کے ریلوے پل سے گزرتی ہوئی اورنگی
ریلوے اسٹیشن جو کہ واصل ناظم آباد کے علاقے بڑا
میدان میں ہے، پر آ کھڑی ہوتی۔

اب شروع ہوتا ہے ناظم آباد کا علاقہ۔ ٹرین ناظم
آباد کے پل سے ہوتی ہوئی تارتھ ناظم آباد ریلوے
اسٹیشن جا پہنچتی ہے جو کہ مجاہد کالونی میں واقع ہے۔ ٹرین
آگے موٹی گوٹھ، گجر نالہ، لہرا اپارٹمنٹ اور اس سے
ملحقہ سراج الدولہ کالج کے پاس سے ہوتی ہوئی لیاقت
آباد میں شاہراہ پاکستان کو کراس کرتی ہوئی گزرتی ہے۔
پھر ٹرین دائیں طرف الاعظم اسکوائر اور بائیں جانب
کریم آباد کے علاقے میں موجود وہلی اسکول کے ساتھ
ہی لیاقت آباد ریلوے اسٹیشن پر آ کر رکتی ہے۔ اب
ٹرین غریب آباد ریلوے کراسنگ سے گزر کر غریب آباد
کے علاقے میں داخل ہوتی ہے۔ دائیں طرف غریب
آباد کا علاقہ ہے اور بائیں طرف گورنمنٹ دہلی کالج آتا
ہے۔ ٹرین یاسین آباد ریلوے اسٹیشن، اسحاق آباد کو
پیچھے چھوڑتی ہوئی سرشاہ سلیمان روڈ پر موجود ریلوے پل
سے ہوتی ہوئی گلشن اقبال کے علاقے میں قائم گیلانی
ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوتی ہے۔ پھر ٹرین کچھ اور
آگے چل کر یونیورسٹی روڈ کو کراس کر کے عزیز بھٹی شہید
پارک اسٹیشن جا پہنچتی ہے۔

اکثر ہم لوگ اس مقام پر پہنچ کر عزیز بھٹی شہید
پارک پر اتر جایا کرتے اور پارک کی سیر کر کے دوبارہ
اسی جگہ سے واپسی کی ٹرین پکڑ کر گھر روانہ ہو جاتے۔
پارک سے ملحق موجودہ سندباد پارک والی جگہ کے عین
سامنے سے ٹرین راشد منہاس روڈ کو کراس کرتی ہوئی
کراچی یونیورسٹی ریلوے اسٹیشن جا پہنچتی ہے۔ یہ ریلوے
اسٹیشن موجود الہ دین پارک کے عین سامنے واقع
ہے۔ یہاں سے آگے ریل گاڑی گلستان جوہر کے
علاقے میں داخل ہوتی اور موجودہ روڈنی ڈرائیو لیک،
راہہ سٹی بلاک 2 اور 3، بائیں طرف ایئر فورس ہیڈ
کوارٹرز اور دائیں آرمی آرڈیننس ڈپو کے عین

جرمنی کے ایک چھوٹے سے شہر میں طوفانِ گردباد کے بعد ایک پراسرار لڑکا نظر آیا۔ وہ کسی پتھر کے مجسمے کی مانند ایستادہ تھا۔ وہ کون تھا، اس بارے میں ہزارہا تحقیق ہوئی مگر اس کا پتا لگایا نہ جاسکا۔ یہ خبر جرمن کی سرحد پار کر کے برطانیہ تک پہنچی اور انگریز ڈیوک دلچسپی لینے لگے۔ اس معما کو حل کرنے میں آدھا یورپ دلچسپی لے رہا تھا۔ اس پر کئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ فلم بنی لیکن معما حل نہ ہوسکا کہ وہ لڑکا کون تھا۔

وہ کون تھا؟

صائمہ اقبال



ایک اہمال براسرار لڑکے کی رواد وجود دوسروں سے مختلف تھا

تھا۔ اس کے بالائی حصہ پر تیلے پتھروں سے بنا شاہی قلعہ خاموش کھڑا تھا۔ وہاں کے باسی سچ جوتھے اور اپنے مکانات کی نگہیں چھتیں سرخ اینٹوں سے بنایا کرتے۔ یہ مئی 1828 کی بات ہے اس وقت تک نو ممبرگ کو

فصلیں ہوا کی دھن براس طرح رقصاں تھیں کھیتوں میں سمندری لہریں پیدا ہونے لگتیں۔ صوب کی شدت سے بچنے کے لیے کسان کھاٹ پر پڑے آرام کر رہے تھے۔ کھیتوں سے کچھ پرے نور ممبرگ کا بچی سرخوں والا شہر

ماہنامہ سرگزشت

تھیں۔ لیکن 1990ء کی دہائی کے دوران پرائیویٹ ٹرانسپورٹر مافیا، کراچی سرکٹرین کے کرتا دھرتاؤں اور اسٹاف کو کرپشن میں ملوث کر کے ان کی ملی بھگت سے اسے ناکام بنانے میں کامیاب رہا اور 1994ء سے یہ نفع بخش ادارہ مالی بد حالی کا شکار ہوا اور پھر آخر کار ان کی حسبِ مشاء 1999ء میں اسے بند کر دیا گیا۔ یوں عوام اپنی ٹرانسپورٹ کی ضروریات کے لیے فقط نجی ٹرانسپورٹروں کے رحم و کرم کے محتاج ہو کر رہ گئے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اب تو مرحوم مجھے تو کراچی شہر کے حسین مناظر سے ٹرین کے اس دلفریب و یادگار سفر کی صورت روشناس کرا گئے لیکن ہم اپنے بچوں کو بھلا کیسے اس سفر کی لذت سے آشنا کر سکیں گے؟

ایک اور بات جو اکثر میرے دل میں آتی ہے اور سوچتا ہوں کہ اگر آج ابوزندہ ہوتے تو میں ان سے کہتا کہ آپ تو کہتے تھے کہ ہمارا ملک اور زیادہ ترقی کرے گا۔ اے کاش کہ آپ دیکھتے کہ آپ کا وہ زمانہ کتنا اچھا تھا اور کتنا اچھا ہوتا کہ آج بھی ہمارا شہر کراچی اور ہمارا وطن پاکستان آپ کے دور جیسا ہی ہوتا۔

لیکن میرا دل اب بھی یہ کہتا ہے کہ اب تو بالکل سچ اور درست کہا کرتے تھے کہ:-

”آنے والے وقتوں میں پاکستان اور مزید آگے جائے گا، حالات موجود صورتحال سے کہیں اور زیادہ بہتر ہوں گے اور انشاء اللہ ہم بہت ترقی کریں گے۔“ (آمین)۔

اور ایسے وقت میں ابو کی بتائی وہ ساری باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں کہ ہمارا یہ شہر کتنا پرانا ہے۔ کس طرح آباد ہوا۔ ریلوے پل پر بیٹھ کر ایک ایک چیز کی جانب اشارہ کرتا۔ وہ بلندنگ کب بنی، کس نے بنائی، ایک ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے جاتے اور بتاتے جاتے۔ بچپن کا دور کئی معنوں میں اہم ہوتا ہے۔ ذہن کا کیونوں کورا ہوتا ہے۔ اس وقت جو تصویر بن جائے وہ ذہن پر عمارت قائم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابو کی فراہم کردہ معلومات آج بھی ذہن و دل پر قائم ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ اس زمانے کے والدین کس طرح اپنے بچوں کو دوسروں سے ممتاز بنانے کے لیے اسے معلومات کا خزانہ بنا دیا کرتے تھے۔ پہلے خود وہ معلومات پڑھ کر اپنے ذہن میں منتقل کرتے اور آج...؟ ذرا سوچئے ہم جن مسائل میں گھرے ہیں اس کی وجہ نظر آ جائے گی۔

درمیان سے گزرتی ہوئی ڈیوہل جنکشن پر پہنچتی۔ اس جگہ سے ذرا سا ہی آگے غالباً ڈائریسیٹ فیکٹری کے پاس ہل پوائنٹ نام کا ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا اور وہاں سے گزرتے ہوئے ٹرین کراچی انٹرپورٹ کے ربن وے کے عین عقب سے گزرتی۔ وہاں چند چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے عقب سے پی آئی اے کے طیارے کھڑے دکھائی دیا کرتے تھے۔ یہاں سے ہماری ریل نا تھا خان پل کے نیچے سے گزرتی ہوئی بائیں طرف کو مڑ کر شاہراہ فیصل کے متوازی میسر کی جانب آگے بڑھتا شروع ہوتی اور شاہ فیصل کالونی اور سعود آباد کے علاقوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی میسر ہالٹ اسٹیشن پہنچ کر اس سفر کی آخری منزل میسر کینٹ پہنچتی۔

اگرچہ میں بھول نہیں رہا تو یہاں سے انجن ٹرین سے کٹ کر دوبارہ اس کے پیچھے جا لگتا اور پھر یوں اس کی واپسی کا سفر شروع ہوتا۔ اب وہاں سے واپسی کا ٹکٹ خریدتے۔ کچھ ہی دیر بعد ٹرین دوبارہ اس اسٹیشن سے روانہ ہو کر واپس شاہراہ فیصل کے متوازی بلوچ کالونی کی طرف جاتے ہوئے پہلے ڈرگ روڈ ریلوے اسٹیشن پہنچتی۔ یہ مقام مجھے بے حد پسند تھا کیونکہ یہاں سے ریل جب شاہراہ فیصل کے بالکل متوازی دوڑتی تو شاہراہ فیصل اپنی دوڑتی بھاگتی ٹریفک کے ساتھ بہت ہی بھلی معلوم ہوتی۔ ٹرین یونہی اپنا سفر کرتی شاہراہ فیصل کے ریلوے اسٹیشنوں کا رساز اور شہید ملت روڈ ریلوے اسٹیشنوں پر رکتی آخر کار چیسر ہالٹ کے اسٹیشن اور کالا پل سے ہوئی کراچی کینٹ پہنچتی۔ وہاں سے روانہ ہو کر شیخ سلطان ٹرسٹ بلڈنگ کے عقب، پی آئی ڈی سی پل اور پھر آگے ڈان اخبار کے دفتر، پاور ہاؤس ایٹنڈ روڈ، اخبار جنگ کے دفتر، نیشنل بینک ہیڈ آفس، آئی آئی چندریگر روڈ کے عقب سے ہوتی ہوئی کراچی سٹی اسٹیشن پہنچتی اور پھر یہاں سے ہمارا گھر صرف ایک اسٹیشن دور رہ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ٹرین ٹاور کے عقب سے ہوتی ہوئی پہلے اولڈ اور پھر نیو سکیم ہاؤس کے عقب سے گزرتی آخر کار ہماری منزل مقصود یعنی پورٹ ٹرسٹ اسٹیشن پر ہم سب کو اتار کر پھر سے آگے کوروانہ ہو جاتی۔

وکی پڈیا کے مطابق کراچی سرکٹرین ریلوے 1964ء میں اپنے قیام کے پہلے ہی برس میں فوری کامیابی کے ساتھ بھرپور منافع بخش اسٹیم ثابت ہوئی۔ جبکہ 70ء اور 80ء کی دہائی کے دوران یہ منصوبہ اپنے عروج پر تھا اور اس وقت روزانہ کی بنیاد پر کراچی بھر میں کل 104 ٹرینیں چلا کرتی

سب میں بھجان، پر پا کر رکھا تھا۔

نقش کا عمل طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ وہ گھنٹوں پر محیط تھا۔

کاسپر کو کمرے کے درمیانی حصے میں بٹھا کر سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ طرح طرح کے سوال ہوئے۔ کبھی تو یوں ہوتا کہ ایک انفرانی بات ختم نہیں کر پاتا کہ دوسرا بولنے لگتا۔ تفتیشی عمل کے دوران لڑکا شدید پریشانی کا شکار دکھائی دیا۔ اتنے لوگوں کو سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ ایک بار تو وہ اپنے بال نوچنے لگا تھا۔ ایک دو بار کپڑے اتارنے کی کوشش کی۔

ناظم شہر اور داروغہ کو اس سے ہمدردی تھی مگر وہ سرکاری کارروائی روکنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ وہ چپ سادھے بیٹھے رہے۔

یہ کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئیں تو بادریا کے ممتاز قانون داں پال جوین کو اس معاملے میں دخل دینا پڑا۔ اس مرد دانے خود کو تفتیش تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس بارے میں سنجیدگی سے تحقیق بھی کی۔ خاندان بادن کی پوری تاریخ کدنگال ڈالی۔ اس وقت کے حالات کا جائزہ لیا جب نواب چارلس کے نوزائیدہ بچے کا انتقال ہوا تھا۔

اسے پتا چلا کہ چارلس کے بعد تخت سنبھالنے والے نواب لوکس کی ماں لوی کا کردار اس پورے واقعہ میں بے حد مشکوک رہا ہے۔ اس نے ایک روایت بھی کھوج نکالی جس کے مطابق جب نومولود شہزادے کا انتقال ہوا تھا کل کی راہ دریوں میں ایک عورت کا بھوت دیکھا گیا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس ہیولا۔ اس کے نظر آنے کے کچھ ہی دیر بعد شہزادہ غائب ہوا تھا۔ نواب چارلس کے انتقال کے بعد جب لوی کا بیٹا تخت پر بیٹھا، تب بادن کے کچھ حلقوں میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ یہ دراصل لوی تھی جس نے شہزادہ کو ایک مردہ بچے سے بدل دیا، تاکہ چارلس بے وارث رہ جائے۔ اس نے کم عمر شہزادے کو قید خانے میں ڈال دیا، کاسپر کوئی اور نہیں وہ ہی بد قسمت شہزادہ ہے۔

پال جوین ایک عقلیت پسند تھا۔ وہ شواہد اور دلائل کا رسیا تھا مگر اس کہانی کی پوری عمارت ایک افواہ پر کھڑی تھی اور اس کی تصدیق کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ لوی کا انتقال ہو چکا تھا اور موجودہ شاہ بادن نے اپنے ایک بیان میں کاسپر کو شاہی وارث ٹھہرانے کی کوششوں کو غیبا مذاق قرار دے ڈالا تھا۔

اس معاملے کو لے کر جب پال آگے بڑھا تو اس پر مزید انکشافات ہوئے۔ اسے پتا چلا کہ اگرچہ ملکہ اپنے مردہ

بچے کو نہیں دیکھ سکی تھی کہ اس وقت وہ بہت علیل تھی مگر کی موت کے وقت شاہی خاندان کے دیگر افراد موجود تھے۔ چند روایات کی رو سے اس کے باپ یعنی شاہ بادن نے اسے دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ یعنی اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ علیل شہزادے کو کسی مردے بچے سے بدل دیا ہوگا۔

پال نے کچھ ایسے ماہرین کا بھی تعاون حاصل کیا۔ اہل بادن کے چہرے مہرے، رنگت اور جسمانی خدو خال واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے کاسپر کا جسمانی معائنہ کیا۔

طویل تحقیق کے بعد پال نے اعلان کر دیا کہ کاسپر تخت بادن کا وارث ہونے کا قصہ فقط افواہ ہے۔ اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ لڑکے کا قد کاٹھ، چہرہ مہرہ اہل بادن سے مختلف ہے۔ پھر یہ بھی بعید از قیاس لگتا ہے کہ اس کا باپ

خاندان کے دیگر افراد اتنی آسانی سے دھوکا کھا گئے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔ ”یہ خیال کہ ایک پراسرار سفید عورت نے شہزادے کو اغوا کر کے اس کی جگہ ایک مردہ بچے کو بچھڑا دیا، اس میں ڈال دیا، بالکل خام ہے۔ شہزادے کی موت کے وقت اس کے اہل خانہ کے علاوہ اس کا باپ بھی موجود تھا۔ اس نے شہزادے کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ یعنی یہ لڑکا، کاسپر

ہاؤز کی طور تخت بادن کا شہزادہ نہیں ہو سکتا۔“

پال کا بیان نہ صرف جرمنی کے تمام بڑے اخبارات میں شائع ہوا بلکہ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی زیر بحث آیا۔ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد نورمبرگ کے معززین اور کپتان ویٹنگ نے پھر یہ مسئلہ اٹھایا کہ لڑکے کو اپنی کفالت کی خود ذمے داری یعنی ہوگی۔ اس شخص میں جو خیالات پیش کیے گئے، ان میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ اسے کسی سرکس کمپنی کے حوالے کر دیا جائے۔

”کاسپر وچپی اور توجہ کا محور ہے۔“ کپتان نے کہا۔ ”سرکس والے اس کے ذریعے بہت سا پیسا کما سکتے ہیں اور یوں وہ اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جائے گا۔“

پال نے اس خیال کو رد کر دیا۔ ”صاحبان، لڑکے کی ذہنی حالت ایسی نہیں۔ میں آپ کی اس تجویز کی مخالفت کروں گا۔“

”پھر آپ ہی فرمائیں، اس شخص میں کیا جانے؟“ کپتان نے سوال کیا۔

”میں نے جناب جارج فریڈرچ ڈوسر سے بات کی ہے۔“ پال نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ وہ نہ صرف ایک مرتبہ شاعر اور دانشور ہیں بلکہ ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی گراں قدر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ وہ ہی میری نظر میں ایک

مئی 2014ء

74

ماہنامہ سرگزشت

ایسے آدمی ہیں جو بد قسمت کاسپر کو پڑھانے کا حوصلہ اور ہنر رکھتے ہیں۔“ لیکن جناب، مسئلہ تو اب بھی وہیں کا وہیں ہے۔“

کپتان نے بات کاٹ دی۔ ”انہیں بھی وظیفہ جاری کرنا پڑے گا۔“

”نہیں۔“ قانون دان نے گردن ہلائی۔ ”وہ رضا کارانہ طور پر یہ کام کریں گے۔ آپ کے علم میں ہے کہ وہ ایک نیک طبیعت انسان ہیں۔ اس وقت بھی وہ ایک نابینا نوجوان کی کفالت کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کاسپر کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں۔“

”مجھے اس میں کوئی عارضہ نظر نہیں آتا۔“ ناظم شہر نے کہا۔ ”میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔“

اجلاس میں موجود تمام افراد نے تجویز کو قبول کر لیا۔ کاسپر کو اب جارج فریڈرچ کو سونپا جاتا تھا۔

اجلاس کے اختتام پر ہر شخص مطمئن تھا۔ معززین شہر کا خیال تھا کہ کاسپر کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو چکا ہے۔ تمام افواہوں کا قلع قمع ہو چکا ہے اور اب اسے ایک چھت بھی مل جائے گی۔

معززین شہر کو اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس روز بادن کے محل میں بھی ایک اجلاس جاری تھا۔ وہاں ایک فیصلہ ہوا تھا۔ کچھ افراد کو خصوصی ذمے داری سونپی گئی اور وہ لوگ تیز رفتاری گھوڑوں پر سوار نورمبرگ کی سمت بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

شاید وہ خوابوں کی دنیا تھی۔ ہر سوس سکون۔ کتابوں کی جادوئی مہک۔ کھڑکی کے باہر ہرے بھرے درخت۔ درختوں پر چھپاتے پرندے۔

یہ جارج فریڈرچ کا مکان تھا اور اب یہ کاسپر کا مسکن تھا۔ وہیں پانچ سو سالوں سے اس کی دوستی ہوئی اور اس کے دل میں یہ ساز سیکھنے کی خواہش چھلنے لگی۔

فریڈرچ اس کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ بڑے صبر کے ساتھ پہلو میں کھڑا رہتا۔ غلطیوں کی نشان دہی کرتا۔ اگر کہیں لڑکے کو مشکل پیش آتی تو کاندھا تھپتھپاتا۔ امید بڑھاتا۔ اگر کبھی اس پر مایوسی طاری ہوتی تو اسے مزے مزے کی کہانیاں سناتا۔

اس کی ملازمہ دزن بھی ایک شفیق عورت تھی۔ وہ کاسپر سے بہت محبت سے پیش آتی۔ فریڈرچ کے مگر متیم تائید لڑکے ہونے سے بھی اس کی اچھی دوستی ہو گئی۔ پھر اس کا پرانا

ماہنامہ سرگزشت

75

دوست پودوسکی اور اس کی ماں بھی وقفے وقفے سے ملنے چلے آتے۔ کبھی کبھار داروغہ اینڈریو بھی آ جاتا۔

کاسپر تیزی سے سیکھ رہا تھا۔ اب وہ چھوٹے چھوٹے جیلے بولنے لگا تھا۔ چال بھی ٹھیک ہو گئی تھی۔ تھوڑا بہت دڑ بھی لیتا تھا۔ پروفیسر نے پہلے اسے پڑھنا سکھایا۔ لڑکے کی

کارکردگی حیران کن رہی۔ چند ہی روز میں وہ الفاظ سے شناسا ہو گیا۔ جب تھوڑی پختگی آئی تو اسے پتل تھادی۔

گولڑے کا خط بہت برا تھا مگر وہ ان الفاظ کو گاند پر منتقل کرنے کے قابل ہو گیا تھا، جو اس نے کتابوں میں پڑھے تھے۔

اب کاسپر کو خواب آنے لگے تھے مگر وہ خوابوں کو بھی حقیقت ہی خیال کرتا تھا۔ اگر خواب میں اس کی کپتان دن ویٹنگ سے ملاقات ہوتی تو صبح ناشتے کی میز پر وہ اس کی تفصیل بیان کر رہا ہوتا۔ تب دزن شفقت سے اس کا ہاتھ دباتی اور کہتی۔ ”پیارے وہ تو فقط ایک خواب تھا۔“

”مگر میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔“ لڑکا تذبذب کا شکار نظر آتا۔

جب تین چار بار یہ واقعہ ہوا تو پروفیسر نے ایک ماہر نفسیات سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ خواب کاسپر کے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔ ممکن ہے کہ قید کے دنوں میں اسے خواب نہیں آتے ہوں۔

”خواب میں انسان وہی چیزیں دیکھتا ہے جو اس نے عام زندگی میں دیکھ رکھی ہوں۔“ ماہر نفسیات نے کہا۔ ”خواب کا تجربہ اس تجربے سے انتہائی حد تک مماثلت رکھتا ہے، جس سے ہم عام زندگی میں گزرتے ہیں۔ کاسپر نے چوں کہ زندگی ایک کٹھری میں گزاری۔ باہر کی دنیا سے کوئی ربط نہیں رہا، کسی انسان کو اس نے دیکھا نہیں، اس لیے وہ خواب دیکھنے کے

انوکھے تجربے سے بھی محروم رہا۔“

اگلی بار جب ناشتے کی میز پر کاسپر نے کہا کہ کل وہ اور پودوسکی گرم پانی کے ٹب میں گھنٹوں بیٹھے رہے تو پروفیسر نے اسے خواب اور حقیقت کا فرق بتایا۔

کاسپر نے حیرت سے سنا۔ استاد کی باتوں پر غور کرنے کی اسے عادت تھی۔ دھیرے دھیرے وہ اس خیال سے ہم آہنگ ہو گیا اور خواب اور حقیقت میں فرق کرنے لگا۔

چند ماہ بعد جب ایک عوامی تقریب میں کاسپر لوگوں کے سامنے آیا تو وہ ایک بدلا ہوا انسان تھا۔ وہ بہت اخلاق سے لوگوں سے ملا۔ ان کی خیریت پوچھی۔ اپنی تعلیم سے متعلق بتایا۔ عشاء بے میں چھری کانٹے کے ساتھ کھانا کھایا۔

مئی 2014ء

اس عمل نے جہاں بہت سوں کو حیران کیا، وہیں چند ایک میں شک کے جڑوں نے بھی جنم لیا۔ یہ وہ حلقہ تھا، جو ابتدا سے کاسپر کا ناقد رہا تھا اور اسے ایک ذہنی تصور کرتا تھا۔ ان کی جانب سے وہ الفاظ میں یہ اعتراض اٹھایا گیا کہ علم و تہذیب سے دور رہنے والا، ایک کوٹھری میں زندگی گزارنے والا انسان اتنی تیزی سے وہ باتیں کیسے سیکھ سکتا ہے جنہیں سیکھنے میں عام حالات میں برسوں لگ جاتے ہیں، جس کے لیے ایک خاص ماحول، معاشرتی اداروں اور درس گاہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس تقریب کے بعد جہاں ناظم اور اس کے ہم خیال لڑکے کے گن گار رہے تھے، وہیں ایک کونے میں کھڑے کچھ افسر سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

تقریب میں چند پادری بھی شریک تھے۔ کاسپر کی کہانی میں وہ اب تک غیر متعلقہ رہے تھے مگر جب انہوں نے کاسپر کو یوں جتنے مسکراتے دیکھا تو ایک نیا خیال انہیں سوجھا۔ نور منبرگ کے مرکزی گرجے میں اگلی صبح خصوصی اجلاس بلایا گیا۔

بحث کا موضوع یہ تھا کہ ایک مسیحی معاشرے میں پیدا ہونے والے بچے کو مسیحی عقائد ورثے میں ملتے ہیں۔ ماں باپ اس کی تربیت کرتے ہیں۔ وہ اہل خانہ کے ساتھ گرجے جاتا ہے۔ وری کتب مذہب سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں۔ یوں اس کا عقیدہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ کاسپر کا معاملہ مختلف ہے۔ اسے نہ ماں باپ کی سرپرستی ملی، نہ گرجے جانا ہوا، نہ ہی کتابوں سے رشتہ رہا، تو اس کے مذہبی عقائد کس نوع کے ہوں گے؟

پادریوں کو یقین تھا کہ کوٹھری میں تنہا زندگی گزارتے ہوئے کسی نہ کسی لمحے ضرور اسے خیال آیا ہوگا کہ ایک برتر قوت ہے جو اس کی خالق ہے۔ ضرور اس نے خدا کی بابت غور کیا ہوگا۔

اجلاس میں اس موضوع پر کاسپر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گو پروفیسر فریڈرچ نے اس کی بہت مخالفت کی۔ انہیں سمجھانے کی کوشش کہ جو حالات اور تصورات انسان کو مذہب کی جانب مائل کرتے ہیں، عقیدے کو تشکیل دیتے ہیں، کاسپر کو کبھی میسر ہی نہیں رہے، مگر پادری نہیں مانے۔

تین پادریوں پر مشتمل ٹیم پروفیسر کے گھر پہنچی۔ پورے ایک ماہ انہوں نے لڑکے سے پوچھ گچھ کی۔ طرح طرح کے مافی کے برعکس اب کاسپر باتوں کو سمجھ کر.....

جواب دینے لگا تھا، مگر اس معاملے میں وہ کور ثابت ہوئی یہی کہتا رہا عقیدہ پر اکتفا خیال کے لیے اسے مزید ضرورت ہے۔ دوسری جانب پادریوں کا اصرار تھا کہ کچھ سمجھنے کے لیے کسی نوع کی پڑھائی لکھائی درکار نہیں۔ کئی روز تک جاری رہنے والی کوشش کے بعد پروفیسر اوب گئے۔ انہوں نے لڑکے کو کھانا مقرر دیتے ہوئے رپورٹ مرتب کی اور جرمن کلیسا کو ارسال کر دی، جس پر جو یونیورسٹی گئی کہ لڑکے کو مذہب کی تعلیم دینے کے لیے خصوصی انتظامات کیے جائیں۔

تاریخی شواہد کے مطابق کلیسا نے اس معاملے پر غور کیا۔ کچھ اقدامات بھی کیے، مگر پھر نور منبرگ میں ایک عجیب دن طلوع ہوا۔

☆☆☆

وہ ایک کھرا آلودہ صبح تھی۔ 17 اکتوبر 1829 کا دن قصبے کے لیے ادا کی اور آکٹاہٹ لے کر آیا۔ زندگی ستھی۔ کھرے کی وجہ سے لوگ بستروں پر پڑے رہنا چاہتے تھے۔

پروفیسر کی حویلی میں بھی خاموشی تھی۔ وہ کتب خانہ میں بیٹھا تھا۔ لڑکا باغ میں بوڑھی ملازمہ دزلن کا ہاتھ ہلاتا تھا۔ عورت نے لڑکے کو کنوئیں سے پانی لانے کو کہا۔ وہ بائیاں بھرا لایا اور اس کے پاس رکھ کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد پروفیسر کتب خانے سے نکلا۔ وہ موسم کا جائزہ لینے کے لیے کھڑکی کے پاس آیا۔ اچانک نظر چوکت پڑی۔ وہاں ایک سرخ دھما تھا۔

”خون؟“ وہ بوڑھیا۔ پروفیسر سیدھا باغ میں گیا۔ ملازمہ مگلوں پر جھکی ہوئی تھی۔

”کاسپر کہاں ہے؟“ وہ چلایا۔

”کاسپر... یہیں تو تھا۔“ عورت سیدھی ہوئی۔ اس کی نظر پروفیسر پر پڑی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”وہ کھڑکی پر خون۔“ پروفیسر نے تھوک نلگتے ہوئے کہا۔ ملازمہ دوڑی۔ انہوں نے کاسپر کا کمر دیکھا۔ وہاں کسی بے ترتیبی کا نشان نہیں تھا۔ پھر وہ باغ کے پچھلے حصے میں گئے۔ وہاں انہیں خون کے چند قطرے ملے۔ بظنی دروازے کی دہلیز پر بھی خون ملا۔ وہ نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے تہ خانے میں جا پہنچے۔

وہ پیاز کے کڈھیر پر بے سدھ پڑا تھا، اس حالت میں کہ ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ میض سرخ ہوئی تھی۔

فورینئر، چارلس

(1772ء-1837ء)

فرانس کا اشتراکی فلسفی۔ جس نے کئی اشتراکی تجربے آزمائے۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد کچھ عرصہ فوج میں ملازم رہا۔ پھر اپنی ایک چھوٹی سی دکان اور ایک چھوٹا سا کارخانہ کھولا، بیشتر وقت مطالعہ کتب میں صرف کرتا۔ ہوتے ہوتے معاشرے کے متعلق اسے اشتراکی نظریے پر یقین ہو گیا۔ اس نظریے کی تشریح میں اس نے کئی کتابیں لکھیں، لیکن کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ آخر مشہور کتاب ”صنعت کا زمانہ کی اشاعت پر اس کی شہرت ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے افلاطون کی بتائی ہوئی طرز پر ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس معاشرے کی آبادی زیادہ سے زیادہ 1620 افراد پر مشتمل ہونی چاہیے۔ عورت اور مرد بالکل آزاد ہوں، ایک خاص عمارت میں رہیں اور ہر شخص کو اس کے طبی رجحانات اور فطری صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جائے۔ اس نظام میں وہ تمام مصنوعی پابندیاں ختم کر دی جائیں جو تہذیب نے انسان کے دل و دماغ پر عائد کر رکھی ہیں۔ یہ معاشرہ دنیاوی طور پر زرعی ہو، جس میں صنعتوں کے فروغ کی مناسب گنجائش ہو۔ چند مقلدوں نے امریکا میں اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے کی کوشش ضرور کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔

مرسلہ: زرینہ وہاب، لاس اینجلس (یو ایس)

”کیا؟“ افسر آگے کوچک گیا۔ چہرے پر تجسس تھا۔

”اس نے کہا کہ...“ لڑکے نے گہرا سانس لیا۔

”نور منبرگ چھوڑنے سے قبل ہمیں مرنا پڑے گا۔“

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

وہ ایک کھرا آلودہ شام تھی۔ تین گھڑسوار شہر کی مشرقی

سڑک پر سرعٹ دوڑ رہے تھے۔ انہوں نے چہرے ڈھانپ

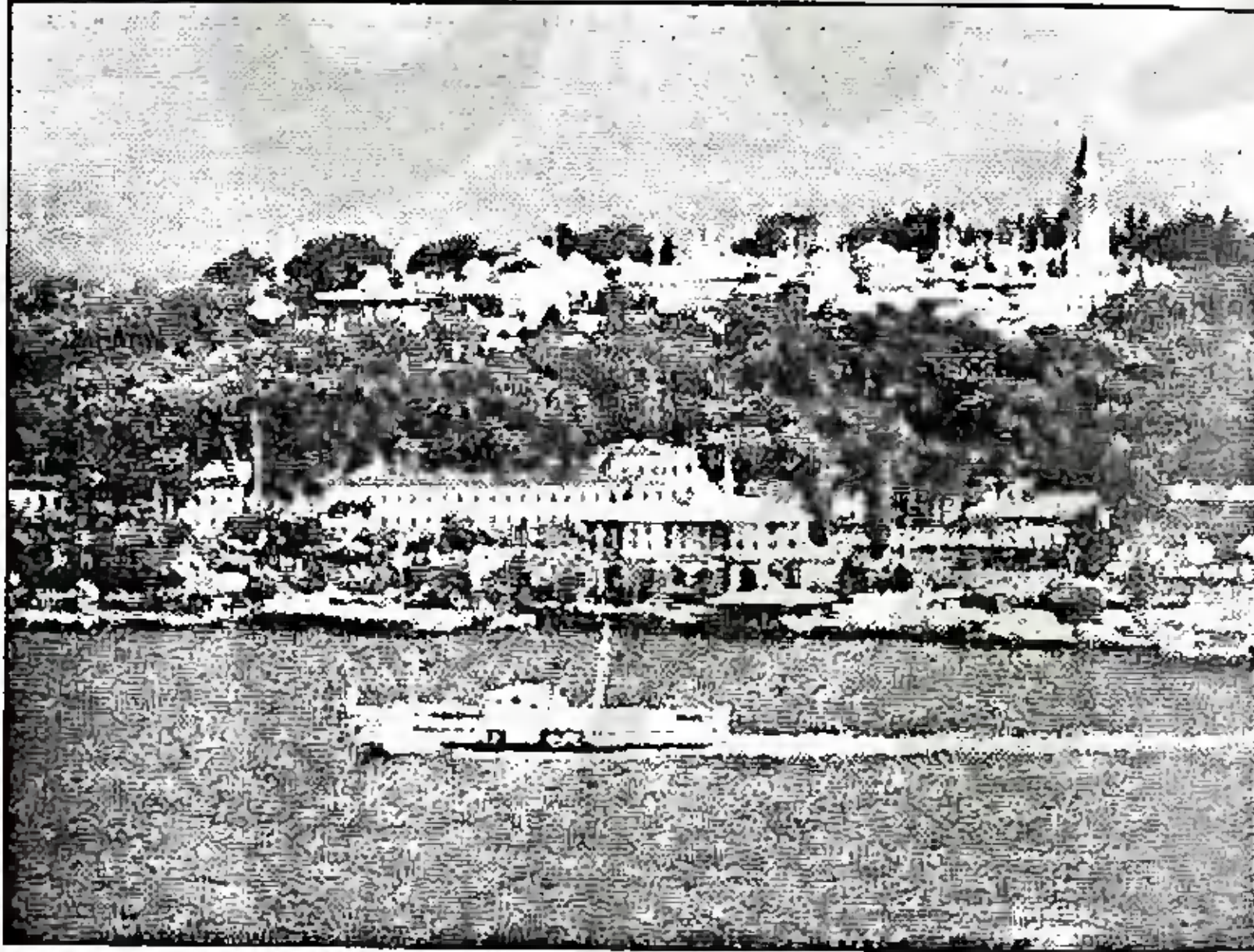
رکھے تھے۔

سازش لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساونڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

ترکی نمی دیم

علی سفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل
سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ
بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان
آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار
کننا تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری
کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ
ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر رہے تھے
ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم
دلچسپ نہیں، وہی کچھ سنار رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست
وہرخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ
آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔



ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی تیرہویں کڑی

عدنان صاحب مصطفیٰ کمال پاشا سے ناراض بھی تھے
اور معترف بھی۔ ناراض اس لیے تھے کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے
ترکی کو ایک جدید سیکولر ملک بنادیا اور ایسی بنیادی تبدیلیاں
کردیں جس کی وجہ سے ترکی کا اسلامی تشخص قائم نہ رہا۔ لیکن
ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ خلافت کے زوال کے ساتھ ساتھ استنبول
میں سازشوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یورپی اقوام خصوصاً
برطانیہ، جرمنی، یونان وغیرہ نے ترکی کا نام و نشان مٹا کر اس
ملک کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ خلیفہ برائے نام

☆☆☆

کاسپر ہاؤز ایک معما تھا۔

اس سے جڑی پر اسراریت نے اسے پورے یورپ کی
توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ موت کو لگ بھگ دو سو برس ہونے کو
ہیں مگر وہ آج بھی تحقیق کا موضوع ہے۔

کاسپر کی موت کے بعد اس واقعے پر قلم اٹھانے والے
پیش تر افراد کی رائے تو یہی تھی کہ وہ واقعی بادن کے تحت کا
دارت تھا۔ تخت پر بیٹا شاہ لوئس اسے خطرہ محسوس کرتا تھا، اس
لیے اسے راہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ پہلی کوشش ناکام گئی، مگر اگلی
بار وہ اپنے منصوبے میں کامیاب رہا۔

اس نظریے کو اتار سے دہرایا گیا۔ یہاں تک کہ شاہ بادن
کو ایک مذمتی بیان جاری کرنا پڑا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ نواب
اسٹیفن نے اپنی جان چھڑانے کے لیے اسے قتل کروایا۔

اس الزام پر انگریز نواب بہت سخت پا ہوا۔ اس نے
مرحوم کاسپر کے ہمدردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم
لوگوں کی عقل پر پروے پڑے ہیں، میں جلد دودھ کا دودھ اور
پانی کا پانی کر دوں گا۔

اس نے ایک کتاب لکھی، جس میں کاسپر کے کیس پر کی
جانے والی تحقیق اور منگری میں گزرے زمانے پر روشنی ڈالتے
ہوئے کئی مشکل سوالات اٹھائے۔ آخری میں لکھا۔ ”میں
اعتراض کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس کے دھوکے میں آ گیا تھا۔“
کاسپر کے حامی اس کتاب کی اشاعت پر آگ بگولا
ہو گئے۔ انہوں نے اسے بے نقط سنائیں۔

اس وقت چند سنجیدہ حلقوں نے کہا کہ نواب اسٹیفن کسی
غلط فہمی کا تو شکار ہو سکتا ہے مگر وہ جھوٹا نہیں، بے حد ایمان دار
اور نفس انسان ہے، مگر ان بے چاروں کی بات کسی نے نہیں
سنی۔ نواب کو صبح شام مغلطات کی جاتی رہیں۔

ان ہی دنوں انسباخ پولیس نے اپنی رپورٹ عدالت
میں جمع کروائی، جس میں بستر مرگ پر کاسپر کی سناکی ہوئی کہانی
پر شک و شبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق
پراسرار قاتل کی جانب سے جو خط چھوڑا گیا تھا، اس میں چپے
کی ایک غلطی ہے، ایک جگہ صرف ونچو کا سٹم ہے۔ اور حیرت
انگیز امر یہ ہے کہ مرحوم کاسپر کی دستیاب تحریروں میں یہ دونوں
اغلاط کثرت سے ملتی ہیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ خط پشیل سے لکھا گیا
ہے اور کاسپر پشیل ہی استعمال کیا کرتا تھا۔ وہ قلم کا عادی نہیں
ہو سکتا تھا۔ خط جس ڈھب پر لکھا گیا تھا، کاسپر کی دادرزوں
سے ملنے والے تمام کاغذات اسی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ یہ

تک ظاہر کیا تھا کہ اس نے خود اپنے آپ کو زخمی کیا تھا۔ بد قسمتی
سے زخم اس کی توقع سے زیادہ مہلک ثابت ہوا۔ وہ اس سے
جال بر نہیں ہو سکا۔

رپورٹ سراسر کاسپر کے خلاف تھی۔ کئی نکات پر
اہم تھے، مگر عدالت نے انہیں شواہد کے بجائے اندازے قرار
دیتے ہوئے نئے سرے سے تفتیش کا حکم جاری کر دیا۔ پولیس
نے خانہ پوری کی کچھ کوششیں کیں، پھر فائل بند کر دی۔
بد قسمتی کاسپر کا کوئی اپنا تو تھا نہیں، جو اس کے لیے بھاگ
کرتا۔ اس کا کیس دب گیا۔

کچھ عرصے بعد ایک پراسرار تحریر منظر عام پر آئی۔ جس
اخبار میں یہ شائع ہوئی اس کا دعویٰ تھا کہ یہ مرحوم پال جوین
کے کاغذات سے ملی ہے۔ وہی قانون دان جو کاسپر کا سب
سے بڑا ہمدرد تصور کیا جاتا تھا۔

تحریر کچھ یوں تھی ”کاسپر ہاؤز ایک فتنہ ہے۔ وہ کسی
کام کا نہیں۔ اس قاتل ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔“
اس نوٹ نے منہنی پھیلا دی۔

کاسپر کے مخالفین نے اسے ایک اہم ثبوت کے طور پر
پیش کیا، تاہم اس کے ہمدردوں نے اسے ٹکسرد کر دیا۔ وہ
اب بھی اسے بادن کا شہزادہ قرار دینے پر ہند تھے۔

موت کے بعد کاسپر کے جسم کی چرچاڑ کی گئی۔ معالجین کا
خیال تھا کہ وہ اس کے جسم سے اس کا ماضی کھوج نکالیں گے۔
اپنے تئیں وہ ایسا کر بھی گئے۔ معالجین نے اپنی رپورٹ میں لکھا
کہ اس کا دماغ عام انسانی دماغ سے تھوڑا مختلف تھا۔ ایک حصہ
نسبتاً چھوٹا، ایک بڑا۔ پھر اس کا جگر بھی عام انسانوں جیسا نہیں
تھا۔ ان ہی اسباب کے باعث کاسپر اوروں سے الگ تھا۔

کیا واقعی ایسا تھا؟

کاسپر کی جسمانی ساخت عام انسانوں جیسی نہیں تھی۔ دنیا
کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت مختلف تھی... یا پھر وہ حقیقتاً شای تخت
کا وارث تھا، جسے ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا۔

تاریخ کی چند غیر مستند کتابوں میں ملتا ہے کہ کاسپر کی
موت کے چند برس بعد نوڈمبرگ کی ایک سڑک پر ایک اور عجیب
عمر شخص کی لاش ملی۔

اس نے لمبا سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہیٹ سے اس کا
چہرہ ڈھکا۔ اسے چاقو کھونپ کر قتل کیا گیا۔

پولیس کو مقتول کی جیب سے ایک کھلوٹا ملا... وہ ایک
گھوڑا تھا!

اور بے بس تھا۔ جس خلیفہ کے پاس نہ مال و دولت ہو نہ طاقت اور نہ ہی اس کو عالم اسلام قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہو اور جو یورپی سفیروں کی پذیرائی کرنے کے لیے حاضر ہوا کسی خلافت کا کیا فائدہ؟ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

مصطفیٰ کمال اور ان کے ہمراہی فوجی یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب یورپی ممالک نے طاقت کے ذریعے ترکی کے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کیا تو ترک فوج کے ناراض عناصر کی ناراضی ناقابل برداشت ہو گئی۔ ترک فوجیوں نے مسلح جدوجہد کرنے کا عزم کیا تو دربار خلافت سے حکم آگیا کہ مدافعت نہ کی جائے لیکن فوج کا پیمانہ ممبر لبریز ہو چکا تھا۔ مصطفیٰ کمال پارے کی طرح حرکت میں آگئے اور انہوں نے خلیفہ کے احکامات کو نظر انداز کر کے شدید مزاحمت کا آغاز کر دیا۔

عدنان صاحب کا کہنا تھا کہ اگر مصطفیٰ کمال نہ ہوتے تو آج ترکی کا وجود ہی نظر نہ آتا۔ عدنان کو اس بات کا اعتراف تھا لیکن ملک کو مغربی اور سیکولر بنانے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان سے وہ راضی نہ تھے۔ لیکن مصطفیٰ کمال کے حامیوں کا کہنا ہے کہ مصطفیٰ کمال واقعی اتنا ترک تھے یعنی ترکوں کے باپ۔ انہوں نے یورپی طاقتوں کے جبروں سے اپنا ملک چھین کر اس کو ایک آزاد، خود مختار ملک بنانے کا آغاز کر دیا تاکہ دوبارہ وہی بدترین صورت حال پیدا نہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اتنا ترک نے کچھ زیادہ بھی کیا لیکن ان کا اور ان کے ہم خیال ساتھیوں کا خیال تھا کہ اگر یہ تبدیلیاں نہ کی گئیں تو ترکی دوبارہ ایسے ہی مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ کٹر مولوی اور علما باہمی لڑائی جھگڑوں میں پڑ کر ملک میں فرقہ بندی شروع کر دیں گے۔ اسلام کے نام کو ایکسپلائیٹ کر کے اس سٹے ہوئے ملک میں کبھی استحکام پیدا نہ ہونے دیں گے۔

ترک خوبصورت اور بہادر قوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں ترک تین براعظموں پر قابض تھے۔ اس زمانے میں ترکی کا رقبہ چالیس لاکھ مربع میل تھا۔ اس کی سرحدیں یورپ میں پولینڈ، ہنگری اور دیانا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنوب میں مشرق وسطیٰ مصر، شام... بھی ترک علاقے تھے۔

سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں ترکوں نے اپنی طاقت کے ذریعے اپنے تسلط کو منوایا تھا۔ مرکزی ایشیا کی دوسری قوموں کی طرح ترک بھی قبائل کی شکل میں رہتے اور

ضرورت کے تحت نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ قبیلے سردار نڈر، بہادر اور بلند حوصلہ ہونا ضروری تھا۔ سردار جس مذہب سے تعلق رکھتا تھا تمام قبیلے کا وہی مذہب ہوتا تھا۔ سردار کا بڑا بیٹا ہی اس کا جانشین ہوتا تھا۔ عثمانی سلطنت کے دور میں ارکان سلطنت تین طبقات میں منقسم تھے۔ ایک اہل علم و قلم، دانش ور، یہ سرکاری دفاتر میں کام کرتے تھے۔ اصحاب سیف، یہ صوبوں کے گورنر ہوتے تھے جنہیں فوج کے لیے فوجی بھرتی کرانے کے عوض جاگیریں اور عہدے دیے جاتے۔ جو ملک فتح کیے جاتے تھے ان کے نو عمر لڑکوں کو قتل کرنے یا غلام بنانے کے بجائے شاہی فوج کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔ عموماً وہ عیسائی ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے حسن سلوک کو دیکھ کر وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔ یہ بادشاہوں کی ذاتی حفاظت کے لیے سب سے موثر اور جانناز ہوتے تھے جو اپنے مالک پر جان قربان کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ انہیں بہت عیش و آرام سے رکھا جاتا تھا لیکن ان کو شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے ان کا نہ گھر ہوتا تھا نہ خاندان۔ ان کی زندگی سمیت ہر چیز سلطان پر نثار کرنے والی ہوتی تھی۔ یہی لوگ اصحاب سیف کہلاتے تھے۔

اصحاب مذہب، یہ مذہب کی تبلیغ کرتے تھے اور اسلام کے لیے خدمات سرانجام دیتے تھے۔ اسلامی دنیا میں صرف ترکی ایسا ملک تھا جہاں مذہب کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ شیخ الاسلام عیسائی پوپ کی طرح وسیع اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات وزیر اعظم کے برابر ہوتے تھے۔ وہ سب سے بڑا مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ دوسرے تمام مذہبی رہنما اور قاضی اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ سلطنت کی تمام مسجدیں، عدالتیں، درگاہیں شیخ الاسلام کے ماتحت ہوتی تھیں۔ اس کو چیف جسٹس، وزیر مذہبی امور، وزیر قانون اور وزیر تعلیم بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس وقت دنیا میں اگر عالم اسلام میں پاپائیت تھی تو وہ ترکی میں تھی۔ اس پاپائیت کی وجہ سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں چونکہ ان کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھے اور ان کی خوشنودی کے لیے عوام مذہب کو روزمرہ کی زندگی میں بھی استعمال کرنے لگے تھے۔ مذہب کو ایکسپلائیٹ کرنے کی وجہ سے معاشرے میں بھی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ملک میں سیکولر نظام ایسے ہی عناصر سے نجات حاصل کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ یہ اسلام کے نام پر اپنا کاروبار چلاتے تھے۔ شیخ

الاسلام کا عہدہ وزیر اعظم کے برابر تھا اس لیے وہ ملکی سیاست اور درباری سازشوں میں بھی حصہ لیتا رہتا تھا اور اپنے مذہبی فرائض کی طرف سے بے پروائی برتا تھا۔ یہ بھی جدید سوچ رکھنے والوں کے لیے قابل قبول نہ تھا۔ سلطان کی افواج جو یورپ تک پہنچ گئی تھیں وہاں سے فوجی نئے خیالات لے کر آئے جن سے شیخ الاسلام اور قاضی وغیرہ لاعلم تھے۔ دنیا بدل رہی تھی۔ مغربی ممالک نے روایت پرستی چھوڑ کر نئے علوم اور سائنس پر زور دینا شروع کر دیا تھا لیکن ترکی میں علما کی سوچ علم و حکمت کے معاملے میں تیرھویں صدی سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ شیخ الاسلام اور ان کے ماتحتوں نے اجتہاد کا راستہ ہی بند کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے نصاب تعلیم اور نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ دنیائے اسلام جہود کا شکار ہو گئی تھی۔ آج بھی وہ سلسلہ جاری ہے کہ علما اور علماء شیخ اور نئے انداز کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے مغربی دنیا آگے جا رہی ہے اور مسلمان پیچھے رہ گئے ہیں۔

ہم نے ان سے دریافت کیا۔ ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی زوال پسندی کو دیکھ کر اتنا ترک نے اپنے ملک کو سیکولر قرار دیا؟“

وہ بولے۔ ”یہ بات بہت حد تک درست ہے۔ اتنا ترک اور دوسرے فوجیوں کا خیال تھا کہ ترکی اگر پرانے بوسیدہ نظام سے باہر نہ نکلا تو ہمیشہ پسماندہ رہے گا چونکہ یہ طبقہ اسلام کو نئے خیالات اور نئے نظام سے بچاتا رہے گا۔“

خان صاحب نے دریافت کیا۔ ”جب اتنا ترک نے خلافت کا خاتمہ کیا تو سارے عالم اسلام میں شور مچا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی خلافت قائم رکھنے کے لیے تحریک خلافت شروع کر دی۔ کیا آپ کے خیال میں خلیفہ کی موجودگی ضروری تھی؟“

عدنان صاحب نے کہا۔ ”دیکھیے، جہاں تک خلیفہ کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ کا مرتبہ عطا کیا ہے۔ آدم کے بعد ان کی اولاد بھی خلیفہ تھی۔ جتنے پیغمبر دنیا میں آئے وہ بھی زمین پر اللہ کے خلیفہ ہی تھے۔ سلطان سلیم اول کردار کے لحاظ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسا نہ تھا لیکن اپنا مرتبہ اونچا کرنے اور زیادہ بااختیار بننے کے لیے اس نے اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ ترکی کے عوام ”اے اللہ ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھنا“ کے نعرے لگاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سلطان کو سلطان یا

بادشاہ ہی تسلیم کرتے تھے یعنی سلطان خلیفہ کا لقب اختیار کرنے کے بعد عالم اسلام کی بڑی سیاسی قوت کے ساتھ ہی مذہبی سربراہ بھی بن گیا۔ کچھ پوچھیے تو میں بھی ”خلیفہ“ کے حق میں نہیں ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جب ہر طرح کی طاقت ایک ہی شخص کو حاصل ہو جائے تو آہستہ آہستہ آمریت اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اتنا ترک نے خلافت ختم کر کے غلط نہیں کیا تھا؟“

”اس سے تو میں متفق ہوں مگر اتنا ترک نے فرسودہ نظام سے نجات حاصل کرنے کے لیے انتہا پسندی کا جو مظاہرہ کیا وہ ضرورت سے زیادہ رد عمل نہیں تھا؟“

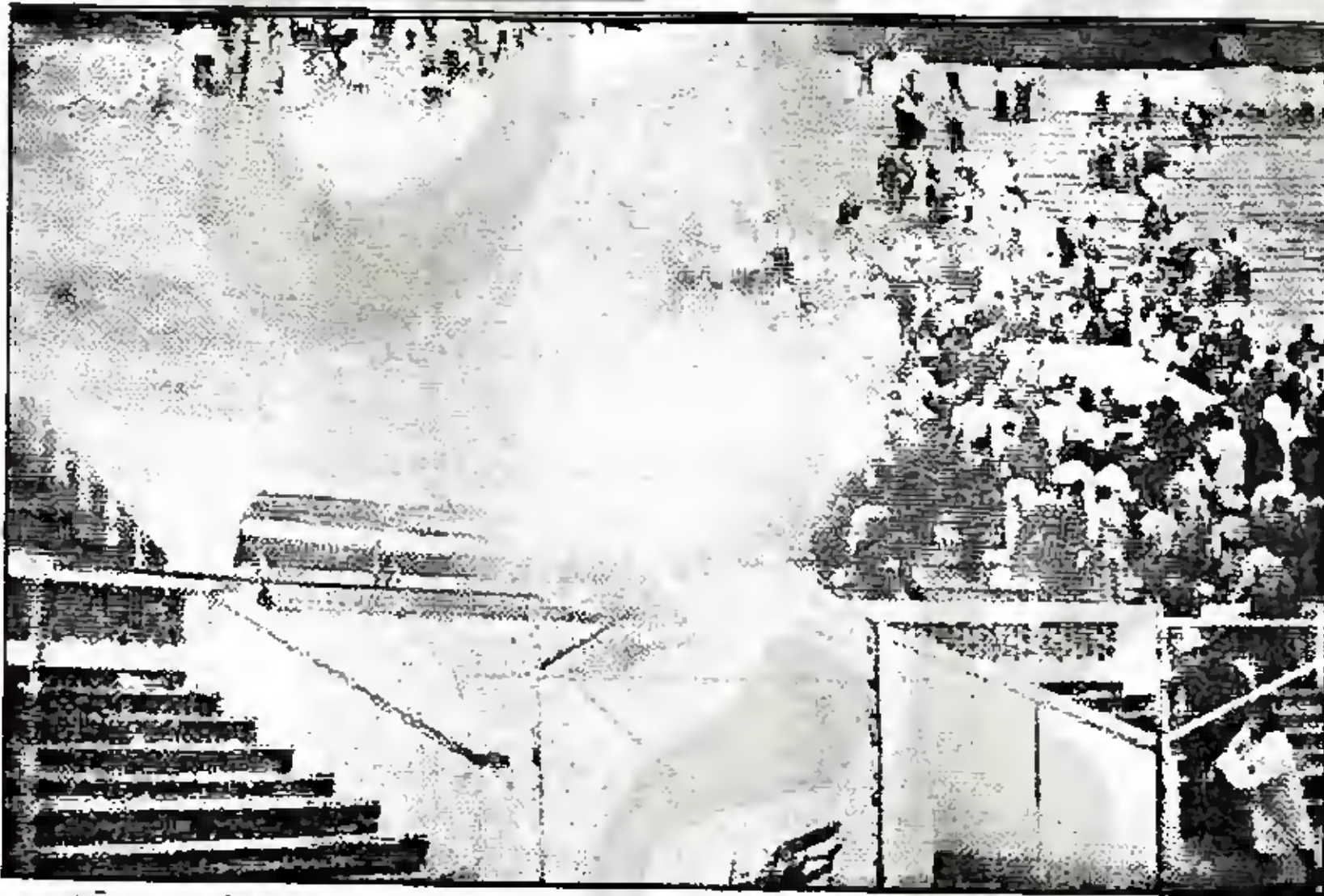
”دیکھیے آغا، ہر شخص کا ذاتی اور سوچنے کا انداز علیحدہ ہوتا ہے۔ مصطفیٰ کمال نے ایک مسلمان گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ اگر آپ نے ترکوں کی قدیم تاریخ پڑھی ہے تو آپ جانتے ہوں گے کہ ترک بہت مذہب پرست تھے۔ انہوں نے جہاں بھی فتوحات کیں وہاں اسلام پھیلایا۔ ترک سلاطین کے زمانے میں عیسائی رعایا کی حیثیت سے ترک مملکت بننے کو عیسائی ملک پر ترجیح دیتے تھے، ترکوں نے کبھی عیسائیوں سے بدسلوکی نہیں کی۔ انہیں بھی دوسرے شہریوں کی طرح حقوق حاصل تھے۔ یہاں تک کہ عیسائی غلام کو اگر مالک سے کوئی شکایت ہوتی تھی تو وہ قاضی کے سامنے شکایت لے کر چلے جاتے تھے اور قاضی ان کے ساتھ پوری طرح انصاف کرتا تھا۔ ترکوں نے کبھی جبر نہیں کیا لوگ ان کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتے تھے۔“

ترک جب یورپ میں گئے تو انہوں نے وہاں بھی اسلام پھیلایا جس کی نشانیاں آج تک موجود ہیں۔ عیسائیوں نے بذات خود اپنی کتابوں اور سفرناموں میں لکھا ہے کہ عیسائیوں کو ترکوں کی سلطنت میں رہنا بہتر لگتا تھا۔ ترک انہیں مذہبی آزادی دیتے تھے۔ مسلمانوں کے برابر تمام حقوق دیتے تھے۔ انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے البتہ جب وہ مسلمان ہو جاتے تھے تو انہیں اعلیٰ عہدے دیا کرتے تھے۔ ہر طرح سے انہیں نوازتے تھے۔ تو پھر مصطفیٰ کمال پاشا کو اسلام سے اتنی نفرت کیوں تھی۔ کیونکہ ترک فوجیوں کے طرز عمل کی بھی عیسائی تعریف کرتے تھے۔ ترکوں کی دیانتداری، انصاف پسندی اور غماز کی پابندی کے بھی معترف تھے۔“



دعا باز

ابن کبیر



اس دنیا میں کیسے کیسے دعا باز کس کس طرح لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ کس طرح دھوکا دیتے ہیں اس کا ایک معمولی سا نمونہ۔ اس مشہور کیس کا تذکرہ جو آج بھی لاینحل ہے مگر یورپ بھر میں زبان زد عام ہے۔

ایک انوکھے دعا باز کا تذکرہ

وہ 13 جون 1994ء کا دن تھا۔
تھامس ایٹون کے قصبے پر موسم گرما اتر چکا تھا۔ بادلوں
تھا۔ تیرہ سالہ نیکلس بارکلی اُس سچ و ہیں تھا۔ جسم پسینے سے
شرابور۔ نیلے رنگ کی جرسی بدن سے چھٹی ہوئی۔
وہ ایک کڑا مقابلہ تھا۔ اس کی ٹیم دو پوائنٹ کے
نکبیر ہاتھ۔ ہواؤں میں گرم لپٹیں تھیں۔

مئی 2014ء

99

ماہنامہ سرگزشت

ان کا کہنا تھا کہ ترک ایک آزاد قوم ہے۔ یہ ترکوں کا ملک ہے اور ان ہی کے لیے ہے۔ یہاں غیروں خصوصاً غیر مسکوں کا وجود۔ برداشت نہیں۔ دوسری طرف خلیفہ اور شیخ الاسلام تھے جو درحقیقت ترکی اور ترکوں کے خلاف ہر کارروائی کو جائز قرار دیتے تھے۔

اللہ کو مصطفیٰ کمال کی حب الوطنی پسند آئی۔ انہوں نے یورپ کے حملہ آوروں کو ترکی سے مار مار کر نکال دیا اور ملک کے چپے چپے پر ترکوں کی حکومت قائم کر دی۔ ان حالات کا مصطفیٰ کمال پر کیا رد عمل ہو سکتا تھا؟ انہیں علماء سے، خلیفہ سے، خلیفہ کے ساتھیوں اور خوشامدیوں سے نفرت ہو چکی تھی۔ انہوں نے طاقت کے ذریعے بیک وقت یورپ کے چار ملکوں کی فوجوں کو شکست دے کر ترکی کو ایک آزاد ملک بنایا تھا۔ انہیں نندار اور مذہب کا باغی کہہ کر مذہب کے نام پر ترکوں کو ان کا مخالف بنادیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت ختم کی اور علماء کے مخالف ہو گئے تو کیا یہ غلط تھا؟

ہم سب خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ یہی تاریخی حقیقت ہے جو وہ بیان کر رہے تھے۔

مصطفیٰ کمال کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے ”اتاترک میں کچھ خامیاں بھی تھیں مگر وہ ان کی ذاتی خامیاں تھیں۔ وہ رنگین مزاج تھے۔ شراب پیٹے تھے۔ عورتیں بھی ان کی کمزوری تھیں مگر ان کی یہ خامیاں ان کی ذات تک محدود تھیں۔ ملک اور قوم کے لیے تو وہ مسیحا تھے۔ وہ ترکی کے وفادار اور جاں نثار تھے۔ یورپ۔۔۔ کی فوجوں کو ترکی سے باہر نکال دینے کے بعد انہوں نے ملک میں انتخابات کرائے اور قومی اسمبلی نے 1924ء میں خلافت کو ختم کر دیا۔ علماء نے ملک کو جو نقصان پہنچایا تھا اور جس طرح فرقہ وارانہ جذبات پیدا کیے اس کے بعد وہ ملک میں ایسے عناصر کو چھپتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ملک میں سیکولر نظام قائم کر دیا کہ ترکی ان خطرات سے بچا رہے جن کی وجہ سے ترکی کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔“

جہاز کا ہونٹ گونجنے لگا تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم استنبول واپس آ گئے ہیں۔ مصطفیٰ کمال سے مل کر اور خدا حافظ کہہ کر ہم استنبول کی سڑکوں پر قدم رکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔

(جاری ہے)

مئی 2014ء

مقابلہ کرنے کے لیے نیشنل اسمبلی کے انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا جو سلطان کو بہت ناگوار گزرا۔ سلطان نے علماء کے مشورے سے انتخابات کو غیر اسلامی اور شریعت کے خلاف قرار دے دیا۔ مصطفیٰ کمال جو اس معاملے میں سرگرم تھے۔ خلیفہ نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اسلام کا دشمن ٹھہرا کر ان کے خلاف عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ شیخ الاسلام نے یہ فتویٰ دے دیا کہ مصطفیٰ کمال اور ان کے ساتھی واجب القتل ہیں۔ ان کو قتل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ”یا غیوں“ کو مروانے کے لیے خلیفہ نے اسلام اور خلافت کی حفاظت کے نام پر ساری دنیا سے چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ مصطفیٰ کمال تو یورپ کے حملہ آوروں کو ملک سے باہر نکالنے کے لیے مختلف محاذوں پر جنگ میں مصروف تھے۔ استنبول میں خلیفہ اور شیخ الاسلام نے مذہب کے نام پر اکساکر جن لوگوں کا گرہ بنایا تھا وہ مصطفیٰ کمال کی جان کے دشمن بن گئے تھے اور ان پر اور ان کے ساتھیوں پر حملے کر رہے تھے۔ اس طرح مصطفیٰ کمال کو ایک ہی وقت میں دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ اگر وہ اپنی اعصاب اور ارادے کے مالک نہ ہوتے تو شاید سب کچھ چھوڑ کر ملک سے باہر چلے جاتے۔ یورپی ملکوں کے سفیروں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا اور خلیفہ کو یقین دلادیا تھا کہ مصطفیٰ کمال کے قتل کے بعد ترک فوج کو شکست ہو جائے گی اور خلیفہ من مانی کر سکے گا۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ مسلمانوں اور ترکوں کا خلیفہ خود اپنے ملک کا دشمن بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی بندھ چکی تھی۔ خلیفہ نے استنبول میں مصطفیٰ کمال کا کورٹ مارشل کروا کر ملٹری کورٹ سے انہیں اور ان کا ساتھ دینے والوں کو موت کی سزا دی تھی۔

مصطفیٰ کمال ایک بہادر اور خود دار انسان تھے۔ وہ ترکوں کی اور ملک کی حفاظت کے لیے دن رات مختلف محاذوں پر جنگ کر رہے تھے اور خلیفہ نے انہیں غدار قرار دے کر موت کی سزا دلادی تھی۔ مصطفیٰ کمال ترکی میں یورپی قوموں کا وجود بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور یورپ والے ترکوں کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہتے تھے جو نہ صرف دنیا کی بہت بڑی طاقت رہ چکے تھے بلکہ یورپ تک کو ترک فوجوں کے قدم روند سکتے تھے۔ یورپ کے عیسائی حکمرانوں کے لیے یہ ترکوں کی عظمت اور غرور خاک میں ملائے کا یہ بہترین موقع تھا۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ مصطفیٰ کمال کے علاوہ کوئی اور بھی ہوتا تو کیا کرتا۔ وہ ایک سچے ترک تھے۔

98

ماہنامہ سرگزشت

تین مئی مشہور و معروف متنازعہ رائٹر سیکاولی کی پیدائش کی تاریخ ہے۔

نکولوسیکاولی 1469 کو اٹلی کے شہر فلورنس میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی کتابوں اور اس کے نظریات نے ایک دنیا کو متاثر کیا ہے۔

خاص طور پر حکمران اور سیاست دان اس سے بہت استفادہ کرتے ہیں۔ اس کی مشہور ترین کتاب ”دی پرنس“ ہے۔ جس کو دنیا کا ہر ڈکٹیٹر بہت شوق سے پڑھتا ہے۔

3 مئی 1898 میں روس میں گولڈ ایئر کی پیدائش ہوئی تھی۔ گولڈ ایئر کو جدید اسرائیل کے بانیوں میں سے سمجھا جاتا ہے۔

4 مئی 1943 میں laorsikorski نے ہیل کا پٹر پیٹنٹ کروایا تھا۔

پانچ مئی 1809 میں میری نای کی ایک خاتون نے اپنی ایک ایجاو پیٹنٹ کروائی۔ وہ پہلی عورت ہے جس نے اپنی کوئی ایجاو پیٹنٹ کروائی ہو۔ اس کی یہ ایجاو ڈشبین کے ذریعے کشیدہ کاری کی تھی۔

5 مئی 1865 کو پہلی ہارڈیکوریشن ڈے منایا گیا۔ یہ جنگ میں مارے جانے والے فوجیوں کی قبروں کی سجاوٹ کا دن ہے۔

5 مئی 1961 اس لحاظ سے ایک یادگار تاریخ ہے کہ اس تاریخ کو امریکی ہوا باز ایلن شیرڈ نے خلا میں کئی منٹوں تک چھل قدمی کی تھی۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد روس نے بھی اپنے خلا باز یوری گگارین کو خلا میں بھیجا تھا۔

5 مئی 1818 ایک بہت بڑے مفکر کی پیدائش کا دن ہے۔ اس کا نام تھا کارل مارکس۔ اس نے اپنے نظریات اور فلسفے سے آدمی دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔

تھے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے امریکی اور برطانوی طیاروں نے خوراک پہنچانی شروع کر دی۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔
کہا جاتا ہے کہ ان طیاروں نے ڈھائی لاکھ پروازیں کیں۔

ہر تھوڑی دیر بعد ایک طیارہ اترتا تھا جو خوراک کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے مٹھائیاں اور کھلونے بھی لے کر آتا۔ برلن کے بچے انہیں کیڑی بمبار کیا کرتے تھے۔
12 مئی 1820 کو مشہور برطانوی نرس فلورنس نائٹ اینگل کی پیدائش کا دن ہے۔ اس نے جنگ کے دوران ترکی جا کر لوگوں کی اتنی خدمت کی کہ اس کی وجہ سے نرسنگ کا شعبہ قابل احترام ہو گیا۔ آج پوری دنیا میں لوگ اس کے نام کو جانتے ہیں۔ اس پر گیت لکھے گئے ہیں۔ دنیا بھر سے بے شمار اعزازات اس کے حصے میں آئے تھے۔

تیرہ مئی
تیرہ مئی کو Tulip day (گل لالہ) ڈے منایا جاتا ہے۔

اس خوبصورت پھول کی سجاوٹ اور اس کا حسن ہالینڈ میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی تاریخ کو 1857 میں برطانوی پتھالوجسٹ رونا لڈروز کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے 1902 میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

تیرہ مئی 1846 میں امریکا اور میکسیکو کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی تھی جو دو سال تک جاری رہی اور جس میں بہت سے لوگ مارے گئے۔

اگر انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ انسان کو سوائے جنگ و جدل کے اور کسی بات سے دو

کی تاریخ۔ لورین فیس ہیری کی پیدائش 1930 میں ہوئی تھی۔ اس نے کئی ڈرامے لکھے۔ اس کے مشہور ڈراموں میں: Tabe اور Araisin in the sun۔ اس خاتون کی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ پہلی سیاہ فام ہے جس کا ڈراما براڈ وے میں کھیلا گیا۔

لیڈ بارگ فلیٹ ڈے Liwd bargh flight day منایا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا 1927 سے ہوتی ہے۔ چارلس لینڈ برگ ایک پچیس سالہ باہمت نوجوان تھا۔ 1927 میں اس نے تھانویارک سے فرانس تک پرواز کی تھی۔ تقریباً 3600 میل تک۔ اس کی یہ پرواز نان اسٹاپ تھی۔ اس کا رٹا سے پر اس نے کئی اعزازات بھی حاصل کیے۔

بیس مئی 1830 میں B. Hyde نے فاؤنڈیشن بین ایجاد کیا جو دنیا بھر میں ہر لکھنے والے شخص کی ضرورت بن گیا تھا۔

1851 میں جرمنی میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے موسیقی کو گھر گھر پہنچا دیا۔ اس کا نام ایملی برٹاکر تھا اور اس کی ایجاد تھا گراموفون۔

20 مئی 325 ad روم میں پہلی عیسائی سلطنت قائم ہوئی تھی۔ حلف برد

نیو کی لائبریری اینڈ فرنیچر پوائنٹ
ساتھ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
ہے اور پرائے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئر لائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئر لائن میں پرسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب و روز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے تو شیر خاص

ان کا چہرہ اسی ان کے پیچھے ان کا برف کیس اٹھائے چل رہا تھا۔ افسر شاہی ہمارے دفتر میں پوری طرح بیدار تھی۔ افسر اپنا بوجھ اٹھانا چک بھٹتا تھا۔ میں بھی ان دونوں کے پیچھے ہولیا۔

اد

میں داخل ہو تو اس کو اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ یوں معلوم ہو کہ وہ ایک ہی گھر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ ایسا ماحول پیدا کرنے میں کیمین کے عملے کے یونیفارم کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ مردانہ عملے کے لباس کا اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا انٹربوسٹس کے لباس سے پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انٹر لائن کا مردانہ عملہ چٹون قمیص میں ہی ملیں ہوتا ہے۔ ان کے کپڑوں کے رنگ بھی تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن زنانہ لباس اکثر مختلف ملکوں کے لباسوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثلاً شلوار قمیص، ساڑی وغیرہ اسکرٹ کے مقابلے میں منفرد ہوتی ہیں۔ یہی انفرادیت انٹر لائن کے کھانوں میں بھی ہوتی ہے۔ سیرین انٹر لائن کا کھانا بھی اسی اصول کے تحت بنایا گیا تھا۔

مشروب تو وہی تھے جو ہر دوسری انٹر لائن میں دیے جاتے ہیں لیکن کھانا عربی طرز اور ذائقے کا تھا۔ میں نے سب سے پہلے سلاو پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ سلاو میں مختلف چیزیں تھیں لیکن ایک چیز ایسی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سلاو کے اوپر ایک ہرے رنگ کی پٹی مجھ

کہ پھر وہ ان سرداروں کو ان کے رشتہ داروں کو دوش نہ ڈالیں گے جس کے نتیجہ میں حقیقی جمہوریت نہیں بننے پائے گی، کہ ان کے خاندانوں کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی جو پاکستان کے لیے نقصان عظیم ہوگا۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو اس نظریہ کا قائل کروں مگر وہ اپنی بات براڑے رہے۔

نمائش کوئی غیر معمولی نہ تھی۔ ویسی ہی تھی جیسے پاکستانی شہروں میں ہوتی ہے۔ جاپان کا عالمی میلہ دیکھنے کے بعد تو اور بھی بے توقیر لگی۔ البتہ ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہاں ایک مقامی صاحب سے ملاقات ہو گئی جو کافی پڑھے لکھے اور شائستہ تھے۔ انگریزی سے بھی واقفیت تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ دو دن دمشق میں ہیں تو یہ بہت اچھا موقع ہے کہ آپ بیروت بھی گھوم لیں۔ بیروت یہاں سے بہت نزدیک ہے۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے پر ٹیکسیاں بیروت کے لیے چلتی ہیں۔ ویزے کی ضرورت نہیں۔ اندھا کیا جا ہے دو آنکھیں۔ میں تو فوراً تیار ہو گیا لیکن باقی ساتھیوں کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

اگلے دن میں نے ٹیکسی پکڑی اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد بیروت میں تھا۔ سرحد پر معمولی چیکنگ ہوئی، کو

پورے زور و شور کے ساتھ گریج رہے تھے۔ کیمبن کے اندر ارتعاش کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی جو انجنوں کے فل پاور پر چلنے کی مہمیں منت تھی۔

ہوائی جہاز کے انجنوں کی فل پاور صرف پرواز کی اٹھان کے وقت استعمال میں لائی جاتی ہے اور فل پاور کے استعمال کا دورانیہ کم سے کم رکھا جاتا ہے اور عام طور سے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فل پاور کے استعمال سے انجن میں جو حدت پیدا ہوتی ہے اس کا جہاز کے کل پروازوں پر منفی اثر مرتب ہوتا ہے۔ ان کے استعمال کا دورانیہ کم ہو جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پرواز کے دوران انجن کو اس کی ریٹنگ سے کم ریٹنگ پر چلایا جاتا ہے۔ کم ریٹنگ پر استعمال کرنے کے باعث انجن کے کل پروازوں کا دورانیہ استعمال بڑھ جاتا ہے۔

فل پاور پر پہنچنے کے بعد پائلٹ نے بریک ریلیز کر دیے اور جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ جہاز کی پرواز کی اٹھان اور لینڈنگ دونوں ہوا کی مخالف سمت پر کیے جاتے ہیں۔ یعنی جب جہاز پرواز کی اٹھان کے لیے دوڑتا ہے اور جب لینڈنگ کے لیے اترتا ہے تو ہوا

نہیں آرہے تھے۔ جب کبھی جہاز اتنی لمبی دوڑ کے بعد بھی فضا میں بلند نہ ہو تو میرے ہاتھوں کی گرفت سیٹ کے ہتھوں پر مضبوط ہو جاتی ہے کہ خدا خیر کرے۔

دراصل جہاز پرواز کی اڑان کے لیے اس وقت تک دوڑ لگاتا ہے جب تک وہ ایک خاص رفتار تک نہ پہنچ جائے کیونکہ جب تک جہاز اس رفتار تک نہیں پہنچ جاتا اس کے پروں کو وہ لٹٹ نہیں ملتی جو اس کو فضا میں بلند ہونے کے لیے سہارے۔ پھر اس رفتار کا انحصار مسافروں اور سامان کے وزن پر ہوتا ہے۔ وزن جتنا زیادہ ہوگا جہاز کی دوڑ بھی اسی تناسب سے لمبی ہوتی جائے گی۔ آج بھی یہی صورت حال تھی، جہاز فل لوڈ تھا۔ یہاں پر ایک اور چیز بھی قابل ذکر ہے۔

جہاز جب پرواز کی اٹھان کے لیے دوڑتے وقت اگر ایک رفتار سے تجاوز کر جائے اور کسی ہنگامی صورت حال کے تحت اس کو روکنے کی ضرورت ہو تو اس وقت جہاز کو روکا نہیں جاسکتا کیونکہ دوڑنے کے انرشیا Inertia کی وجہ سے جہاز کے ڈھانچہ میں اس قدر توانائی آچ

نہ محسوس ہوا تو میں نے جانا کہ انہوں نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ دوبارہ اپنا نام بتایا۔

انہوں نے اسی سکون سے مجھ کو مطلع کیا کہ ان کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ میں کون ہوں۔ پھر مجھے یونیورسٹی کے ایک ہاسٹل کا نام پتا بتایا اور حکم صادر کیا "تم وہاں جا کر کمرانمبر 12 میں قیام کرو کل صبح میرے دفتر آ جانا۔" پھر جیسے ان کو کچھ یاد آ گیا۔

"گو کہ تم سولہ دن دیر سے یونیورسٹی آئے ہو

پایا۔ لفافہ ان کو تھما دیا۔ لفافہ میں رکھے ہوئے کاغذات پڑھنے کے بعد مجھ سے کلام کیا۔
”تم EE میں MS کرنا چاہتے ہو؟“

یا خدا یہ ”EE“ کیا بلا ہے اور میں اس میں کیوں MS کرنا چاہوں گا۔ استفسار پر پتا چلا کہ ”EE“ الیکٹریکل انجینئرنگ کا مختف ہے۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

شوہرین ملین

مشکیل صدیقی



پاکستان کے گنے چنے اساتذہ فن کے درجے پر پہنچنے والے اس باکمال شخص نے اس درجہ کمال کو حاصل کرنے کے لیے کتنی محنت کی، کس طرح وہ فن کی بلندیوں پر پہنچا اسی انتہک ک

مانوس ہو گئے اور جھنڈے سے جھنڈے تک اسے دیکھنے لگے۔

اسی اثنا میں ضیاء محی الدین شو 1971ء میں پیش کیا گیا، جو ایک ٹاک شو تھا جس میں ملک کی مشہور و مقبول ہستیاں کو شریک ہونے کی دعوت دی جاتی تھی۔ ان سے دل چسپ سوالات کیے جاتے تھے۔ درمیان میں چند دوسرے فنکار بھی حصہ لیتے تھے اور

تھا کہ ہر چیز نظم و ضبط کے دائرہ کار میں ہو۔ اس کا اصرار تھا کہ میں فلم کی ہیر دُن سے ملاقات کروں، تاکہ شوٹنگ سے پہلے ہمارے درمیان کچھ شناسائی پیدا ہو جائے۔ اگر ہم فلم میں ہیر دُن ہیر دُن ہیں تو عام زندگی میں کم از کم دوست ضرور ہوں۔

یہ ملاقات ہیر دُن کے اپارٹمنٹ میں ہونا قرار پائی۔ ہ

ضیاء کا کہنا ہے کہ یہ غلط ہے کہ میں بولتا بہت ہوں، یقین کیجئے کہ میں نے سنا بہت ہے۔ میں نے اردو کے اچھے بولنے والوں کو سنا ہے۔ جب میں صرف چھ برس کا تھا تو میں نے سر عبدالقادر، پنڈت برج موہن دتاتریا کو بولتے سنا۔ میں نے ان کے بارے میں یہی تم

دو گنا ہو جائے۔

میرے دادا کو انگریزوں نے ایک قطعہ اراض

